188769

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_188769
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

صد پارۂ دل

تذکرۂ مشاہیر عالم

مؤلفہ نامی مورخ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی

جسمیں مندرجہ ذیل نامور ممتاز مشاہیر عالم کی سوانح عمریاں درج ہیں
تاریخی حالات کیا ہیں گویا دل کے ٹکڑے نکالکر رکھدئے ہیں

١ خلیفہ ناصر الدین اللہ
٢ زبیر ابن عوام
٣ عبداللہ بن زبیر
٤ اعزالدین حسین
٥ محمد بن تومرت المہدی المغربی
٦ ذہبی
٧ جبلۃ بن ایہم
٨ ابو عثمان سعید بن مسجح
٩ ابن بطوطہ
١٠ حاتم طائی
١١ مانی
١٢ سباتائی سیوی
١٣ بقراط
١٤ جالینوس
١٥ سالدین
١٦ دمشق و جامع بنی امیہ

سید ظہور الحسن مالک قومی پریس علی گڑھ نظام الملک نے بماہ اپریل ۱۹۱۳ع
جے اینڈ سنیز پریس دہلی مین طبع کراکر شائع کیا
قیمت عہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خلیفہ ناصرالدین اللہ

ہمارے بعض دوست جو آگرہ اور دہلی کی قدیم اسلامی عمارتوں کے کھنڈر دیکھ آئے ہیں وہ اگلے اسلامی جبروت کو یاد کر کرکے اکثر اوقات اس درجہ متاثر ہو جاتے ہیں کہ دنیا کی تمام ترقیاں اور ناموروں کی ساری عزتیں اُن کی نظر میں ہیچ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ دُنیا کی ناپائداری اور دنیاوی کمالات کی بے وقعتی دیکھ کے واقعی زندگی سے جی ہٹا جاتا ہے اور دل پر کچھ ایسی افسردگی طاری ہو جاتی ہے کہ کچھ کرنے ہی کو جی نہیں چاہتا۔ اگرچہ قدیم کھنڈروں کی زیارت سے یہ بہت بُرا اثر دلوں پر پڑتا ہے اور پست ہمتی آئندہ ترقیوں سے روکنے لگتی ہے لیکن اس سے ایک عظیم الشان فائدہ بھی ہوتا ہے۔ ضعیف دل اور جلد تھک جانے والی طبیعتیں چاہے مایوس ہو کے بیٹھ رہیں مضبوط اور مستقل دل انہیں حسرتکدوں کو ناموری کی ایک نظیر پاتے ہیں اور اُن میں یہ جوش پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے قدیم عالی ہمت بزرگوں نے جب ایسے ایسے اولوالعزمی کے کام کئے ہیں تو ہمیں بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہئے۔ اور اگر ہم حقیقت میں مایوس ہو گئے ہیں اور ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا تو ایک حیثیت سے قدیم منہدم عمارتوں کی طرف ہمیں اور زیادہ توجہ

کرنا چاہیئے۔ اصل میں پوچھیئے تو منہدم عمارات قدیم نہیں ہیں بلکہ سلف کی ناموریوں اور اُن اولوالعزمیوں کی مجسم لاشیں ہیں جو آج ہمیں بے گور و کفن پڑی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر ہمیں توفیق ہوتی یا ہم میں ہمت ہوتی تو ہم ان لاشوں کے ساتھ عمدہ سلوک کرتے اور انھیں اچھے اچھے کفنوں میں لپیٹ کے رکھتے اور اگر اتنی توفیق نہیں تو ہمیں چاہیئے کہ یہ لاشیں اپنی قوم کے سامنے ڈالدیں تاکہ سب کے سب حلقہ ماتم باندھ کے ان کے گرد بیٹھیں اور روتے روتے ان کے ساتھ اپنے آپ کو بھی فنا کر دیں۔

اے وہ دوستو! جو ہندوستان کی عمارتوں پر آنسو بہا رہے ہو سُنو۔ یہ عمارتیں تو اُس مُلک میں ہیں جہاں پانچ کرور آدمی توحید کے قائل اور ان پر حسرتنا کی سے آنسو بہانے والے موجود ہیں اور جہاں ایسی آزاد گورنمنٹ ہے جو تمہاری حسرتوں میں شریک ہونے کو اور تمہیں تسلی دینے کو موجود ہے۔ آؤ ہم تمہیں وہ اسلامی یادگاریں دکھائیں جو ایسی سرزمین میں ہیں جہاں ایک متنفس بھی نہیں جس پر ٹھیک طور سے موحد کا اطلاق ہو سکے۔ جہاں کی اکثر عمارتیں کلیسیا کا کام دے رہی ہیں کسی زمانے میں وہاں ایک خدائے واحد پکارا جاتا تھا اور آج وہ توحید پامال کر دی گئی اور اب انھیں عمارتوں میں علی الاعلان تین خدا پکارے جاتے ہیں۔ ایسی عمارتیں بھی خوش نصیب تھیں کہ کسی طرح سہی دست برد زمانہ سے بچ تو رہیں۔ افسوس تو ان عمارتوں کا ہے جو ویرانوں میں پڑی ہوئی ہیں اور کسی کو اتنی اجازت بھی نہیں کہ آج اُن کے کھنڈروں پر بیٹھ کے اگلے جاہ و جلال کو یاد کرے اور دو آنسو بہائے۔ غرناطہ کے قصر حمرا کا نام اکثر لوگ سن چکے ہیں مگر قرطبہ کے گرد و جوار کی عمارتوں کا تذکرہ بہت کم لوگوں سے سُنا ہوگا۔ ہسپانیہ عظمیٰ کے اُموی خلیفہ امیرالمومنین ابوالمعترف عبدالرحمان الناصرالدین اللہ کو عمارتوں کا نہایت شوق

تھا اگرچہ اُسکی زندگی زیادہ تر فتوحات اور فوج کشی میں گذری مگر جس عظمت وشان کی عمارتیں اُس نے قرطبہ کے گرد وجوار میں تعمیر کرائیں ممکن نہیں کہ کوئی بادشاہ سو برس اطمینان کے ساتھ حکومت کرنے کی صورت میں بھی تیار کرا سکے۔

عبدالرحمٰن ثالث سلسلہ خلافت میں اندلس کا آٹھواں تاجدار تھا اور اپنے نام کے لحاظ سے تیسرا عبدالرحمٰن تھا جو ہسپانیہ کے اورنگ خلافت پر جلوہ افروز ہوا۔ پہلا عبدالرحمن بن معاویہ بانی خلافت اسپین تھا جو مشرقی دنیا میں بنی امیہ کے زوال کے بعد عباسیوں کے ہاتھ سے بچکر نکلگیا اور افریقہ کے ریگستانوں میں دشت نوردی کرتے کرتے اندلس کا فرمانروا ہوگیا۔ عبدالرحمن بن معاویہ لیاقت اور نیز شجاعت کے لحاظ سے ایسا شخص تھا کہ یوروپین اور نیز ایشیائی مورخین کے قلم اُس کے کارنامے دکھاتے وقت بڑا جوش وخروش دکھاتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن معاویہ سنہ ۱۷۲ ہجری میں واصل بحق ہوا۔ دوسرا عبدالرحمان عبدالرحمٰن بن حکم تھا جو چوتھا جانشین خلافت اسپین تھا۔ عبدالرحمان بن حکم نے بھی دنیا میں بڑی بڑی اولوالعزمیاں دکھائیں اور سنہ ۲۳۸ ہجری میں دنیا سے رخصت ہوا۔ تیسرا عبدالرحمن الناصر الدین اللہ تھا جس کا حال مختصر ہم بیان کرنا چاہتے ہیں خلیفہ ناصر الدین اللہ شاہزادہ محمد بن عبداللہ کا بیٹا تھا باپ ایام ولیعہدی میں خلیفہ عبداللہ کے مخالف ہوگیا تھا اور خود شاہی فوج کے مقابلہ میں ایسا زخمی ہوا کہ دو ہی چار روز کے بعد مر گیا اور اسی وجہ سے ناصر الدین اللہ کو لوگ عبدالرحمٰن بن محمد المقتول کہتے تھے شاہزادہ محمد کے مرنے کے بعد خلیفہ عبداللہ کو اپنے پوتے عبدالرحمٰن سے ایسی محبت ہوگئی کہ اُسکے سامنے وہ تمام دنیاوی سامان کو ہیچ جانتا تھا اُسکی تعلیم وتربیت کے لئے ملک کے منتخب علماء اور اہل کمال مامور کئے گئے آٹھ ہی برس کے سن میں قرآن کی تعلیم سے فراغت ہوگئی اور تمام مسائل اعتقادی

ازبر کرا دئے گئے۔ اُسکے بعد حدیث کی کتابیں پڑہائی گئیں پھر تاریخ اور تمام علوم کی طرف توجہ کی گئی۔ شاہزادہ عبدالرحمٰن ایک زبردست عالم کے رتبہ کو پہونچ چکا تو فنون جنگ سکہائے گئے۔ ۵۔ ربیع الاول ۳۰۰ھ کو خلیفہ عبداللہ نے سفر آخرت کیا اسکے بعد عبدالرحمٰن الناصرالدین اللہ خلیفہ قرار پایا۔ خلیفہ ناصرالدین اللہ جب تخت پر بیٹھا ہے اُسوقت بائیس ہی برس کی عمر تہی۔ مگر مورخین اعتراف کرتے ہیں کہ اسکی دانائی اور ہوشیاری اس سن کی حیثیت سے بدرجہا زیادہ تھی۔ علاوہ فہم و فراست کے خدا نے عبدالرحمٰن کو صورت بہی ایسی دی تہی کہ تمام ملک میں اُسکے حسن و جمال کا شہرہ تھا عبدالرحمٰن کی ماں ماریہ ایک معزز عیسائی خاندان کی لڑکی تھی۔ عبدالرحمٰن نے تخت پر بیٹھتے ہی مُلک کی آمدنی تین حصوں پر تقسیم کردی۔ ایک حصّہ سے فوج آراستہ کی جاتی تھی ایک حصّہ عمارت کے کام آتا تہا اور ایک حصّہ بیت المال یعنی خزانہ شاہی میں جمع کیا جاتا تہا اور اسی انتظام کی وجہ سے اُسکو تعمیر کے متعلق اپنے حوصلہ پورا کرنے کا بخوبی موقع ملا۔ ۳۰۵ھ میں قرطبہ کے سب سے بڑے بازار میں آگ لگ گئی اور ایسی آگ لگی کہ کئی روز تک کسی طرح بجھائی نہ جا سکی۔ تین شبانہ روز عالیشان اور سر بفلک عمارتوں پر شعلے بھڑکتے رہے۔ خانماں برباد اہل قرطبہ کے آنسو اُس فیاض اور اولوالعزم بادشاہ خلیفہ الناصرالدین اللہ نے یوں پونچہو کا حکم دیا تمام منہدم عمارتیں بہ سبب سابق کے زیادہ خوشنمائی اور خوبصورتی کے ساتھ تعمیر کردی جائیں اور کل مصارف کا بار خود سلطنت پر ڈالا جائے۔

یوں تو اس حوصلہ مند خلیفہ نے خاص قرطبہ میں صدہا عمارتیں تعمیر کرائیں مگر اُسکے شوق اور اُسکی اولوالعزمی نے اپنا پورا زور اسوقت دکھایا جب اُسکے حکم سے قصر زہرا کی نبیاد ڈالی گئی۔ خود اسپین کا مورخ کانڈی کہتا ہی کہ اس خلیفہ کے حرم میں ایک پری جمال اور حور وش لونڈی تھی بادشاہ اُس سے نہایت مانوس تھا

اور اُسکے سراپا ناز شوق خلیفہ کے شاہی حوصلوں کو اور لے اڑے۔ زہرا اُس لونڈی ہی کا نام تھا اور اُسکی طرف منسوب کرکے بادشاہ نے اُس محل کا نام قصر زہرا رکھدیا خلیفہ ناصر الدین اللہ بہار اور خزاں کے موسم میں ایک نہایت ہی عمدہ سبزہ زار میں گذارا کرتا تھا جو قرطبہ سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر دریائے وادی الکبیر کے کنارے واقع تھا اُسی مرغزار میں اُس قصر کی بنیا ڈالی گئی۔ قصر کے بعد اسلامی جوش نے اُسکے برابر ایک مسجد تعمیر کرائی جو جامع زہرا کے نام سے یاد کی گئی۔ اور آخر شاہی درباروں کی ضرورت سے خلیفہ نے اُس قصر کے گرد ایک پورا شہر آباد کردیا جو مدینۃ الزہرا کہلاتا تھا افسوس مُلک اسپین کا جغرافیہ آج اس شہر سے خالی معلوم ہوتا ہے مگر آثار قدیم ڈھونڈھنے والا تواریخ کے صفحوں پر دیکھے گا کہ مدینۃ الزہرا ایک نہایت ہی خوشنما بلکہ اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے ایک عجیب و غریب شہر تھا۔

مورخین کہتے ہیں کہ قصر زہرا کی تیاری کے بعد تمام مبصروں اور جہاندیدہ لوگوں نے اتفاق کرلیا کہ دنیاے اسلام اُس عمارت کی نظیر سے خالی ہے حتے کہ اُن دنوں غیر سلطنتوں کے سفیر اور دُور دُور کے مسافر آکے اُس عمارت کو حیرت و استعجاب کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور یقین کرلیتے تھے کہ ایسی دنیاوی بہشت نہ دیدہ ہے نہ شنید بلکہ اعتراف کرتے تھے کہ اس خوشنمائی اور عظمت و شان کی طرف کسی کا خیال ہی نہ گیا ہوگا۔

۳۲۵ھ میں قصر زہرا کی تعمیر شروع ہوئی اور ابتدا سے آخر تک روزانہ چھہ ہزار سلیں آتی تھیں جو نہایت خوبصورتی کے ساتھ بڑی بڑی چٹانوں سے تراشی جاتی تھیں اور اینٹ کی جگہ صرف ہوتی تھیں۔ وہ سلیں جو فرش کے کام آتی تھیں وہ انسے علحدہ تھیں اور اُن کا شمار ان اینٹوں میں نہ تھا۔ ڈھلائی وغیرہ کے کام کے لئے چودہ سو خچر روزانہ کام دیتے تھے جنمیں چارسو تو خاص شاہی باربرداری کے تھے اور ایک ہزار کرایہ پر آتے تھے۔ جنمیں سے ہر ایک کو روزانہ تین مثقال مزدوری

دی جاتی تھی۔ ایک دن درمیان چھوڑ کے ہر تیسرے روز گیارہ سو بوجھ کانپ اور چونے کے آتے تھے۔

قصر کے ساتھ ہی ساتھ مدینہ زہرا کی بھی عمارتیں بنتی رہیں قصر اور جامع زہرا کا کام تو خلیفہ ناصر الدین اللہ کی زندگی ہی میں پورا ہو چکا تھا مگر مدینہ زہرا کی عمارتیں پچیس ۲۵ برس تک اُسکے عہد میں تعمیر ہوئیں اس لئے کہ ۳۲۵ھ میں عمارت کا کام شروع ہوا تھا اور ۳۵۰ھ میں خلیفہ عبدالرحمٰن نے انتقال کیا۔ اور پندرہ برس تک اسکے بیٹے خلیفہ حکم کے عہد میں مدینۂ زہرا کی عمارتوں کا کام جاری رہا بہت سے حمام بنوائے گئے تھے جمیں سے ایک تو قصر زہرا کے متعلق تہا اور خاص بادشاہ اور وزراء کے لئے مخصوص تہا باقی حمام اہل شہر کی ضرورتوں کے لئے تھے بعض وہ لوگ جو زہرا کی تعمیر میں کسی خدمت پر مامور تھے انکا بیان ہے کہ صرف عبدالرحمٰن کے زمانہ میں اُسکے آخر عہد تک پچھتر لاکھ اشرفیاں اس کام میں صرف ہو چکی تھیں اُسکے بعد حکم کے عہد میں جو کچھ صرف ہوا وہ علٰحدہ ہے۔

سنگ رخام عموماً تونس اور دیگر ممالک افریقہ سے لایا جاتا تہا۔ عبداللہ بن یونس حسن بن محمد اور علی بن جعفر اسکندرانی نے سنگ رخام فراہم کرنے کا کام اپنے ذمے لیا تھا اور ہر چھوٹی اور بڑی سل کے معاوضہ میں دس دینار انعام پاتے تھے۔ باقی تمام پتھر خاص سرزمین اندلس کے تھے۔ لیکن گلابی اور سبز رنگ کے پتھر افریقہ کے ایک مشہور کنیسہ اسفاقس سے لائے گئے تھے۔ قصر زہرا میں سنگی ستونوں کا کوئی شمار نہ تہا۔ مورخ ابن حبان بیان کرتا ہے کہ قصر زہرا میں چھوٹے بڑے سب چار ہزار تین سو بارہ ستون تھے۔ بعض تو نیچے تھے اور بعض نیچے والے ستونوں کے اوپر قائم کئے گئے تھے۔ وہ خاص ستون جنپر مرصع کاری کی ہوئی تھی اُنکی وضع ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا نیچے تصویریں ہیں اور ستون اُن تصویروں کے منہ میں اترے ہوئے

ہیں۔ کچھ ستون تو روما دارالسلطنت اٹلی سے آئے تھے اور بعض وہ تھے جنکو قسطنطنیہ کے بادشاہ نے ہدیۃً بھیجا تھا۔ ان کی نسبت بعض مورخین نے تصریح کردی ہی کہ ایکہزار تیرہ ستون افریقہ سے آئے تھے۔ انتیس ۲۹ ستون فرنگستان سے بہم پہونچائے گئے تھے اور ایک سو چالیس ستون قیصر روم نے ہدیۃً بھیجے تھے۔ اس قصر میں چھوٹے بڑے سب ملاکے پندرہ ہزار سے کچھ زائد دروازے لگے تھے۔ اور کل دروازوں پر لوہے اور تانبے کی چادریں چڑہی ہوئی تھیں اور اُس لوہے یا تانبے پر سونے کا پانی پھیر دیا گیا تھا۔ جسکی وجہ سے اس قصر پر آفتاب کی شعاعیں ایک عالم نور کا سماں دکھارہی تہیں۔ اس قصر پر سونا زیادہ پھیرا گیا تھا اور در و دیوار پر سونے کے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے اور ہر چہار طرف مرصع کاری کی گئی تھی جسکی جھلک آنکھونکو خیرہ اور دلوں کو متحیر کردیتی تھی بخصوص قصر کا گنبد اور وہ بڑا کمرہ جو مجلس الذہب کہلاتا تھا ان دونوں کی آب وتاب اور شانداری نے دنیا بھر کے سیاحوں کو اپنا والہ و شیدا بنالیا تھا۔

اس قصر اور اُسکے گرد کے باغ کی زیب و زینت کیلئے خلیفہ ناصر نے ایک نہر بنوائی تھی اسمیں جو صفتیں اور کاریگریاں صرف کی گئی تہیں انہوں نے عقلمندوں کو اور زیادہ حیرت و استعجاب میں ڈالدیا تہا۔ یہ نہر جبل قرطبہ سے لائی گئی تہی۔ نہایت شیریں لطیف اور سرد پانی آتا تہا اور قصر ناعورہ میں جو قرطبہ کے مغرب جانب تہا جاتا تھا۔ قصر ناعورہ بھی زہرا کی ایک بے مثل عمارت تہی اور کئی بلند چبوتروں پر اسکی کرسی دی گئی تہی اس نہر میں یہ صفت رکھی گئی تھی کہ ان تمام اونچے چبوتروں پر جنپر قصر بنا دیا گیا تہا چڑہتی تھی اور کل عالیشان پشتوں پر ہوکے گذرتی تھی جو قصر ناعورہ کے آس پاس واقع تھے۔ انتہائی بلندی پر ایک نایاب اور خوشنما سنگ رخام کا حوض تھا اور اُسکے کنارے پر ایک بہت بڑا شیر بناکے بٹھایا گیا تہا شیر پر طلائی

گلکاری بنی تہی - اور ایسے ایسے قیمتی جواہرات لگائے گئے تھے کہ اُسکی چمک دمک دُور سے دیکھنے والون کو دہوکا دیتی تہی کہ حوض کے کنارے سے آفتاب طلوع ہو رہا ہے اور شیر کی صورت ایسی ہیبت ناک اور رعب دار بنائی گئی تہی کہ دولت اموِیہ کے رعب و داب کی تصویر آنکھون کے سامنے پھر جاتی تھی - مورخین کہتے ہین کہ شاہان سلف نے اپنے آثار دکھانے کے لئے جتنی صنعتین پیش کی ہین یہ شیر اُن سب سے بڑھا ہوا تھا - نہر چبوترون اور پشتون پر چڑھ کے اُس شیر کے پیچھے گئی تھی اور پانی شیر کے پیٹ سے چڑہکر اُسکے مُنہ سے حوض مین گرتا تہا - اور حوض کے چارون کونون سے چھلک کے باغ مین جاتا تھا - اور تمام چمنون کی آبیاری خود بخود اُس پانی سے ہوتی رہتی تھی - چمنون مین ہر جگہ ایسی نالیان بنائی گئی تہین - کہ نونہالان چمن کی سیرابی کے بعد جسقدر پانی بچتا تہا اُن نالیون کے ذریعہ سے پھر اُسی نہر مین واپس چلا جاتا تہا - صرف یہی صنعت ایسی بے مثل رکھی گئی تھی کہ آخر ناعورہ اور اُسکا چمن اور یہ حوض ان دلون اظہار دولت وسطوت کے بہت بڑے بے مثل و بے نظیر نمونے خیال کئے جاتے تھے - یہ نہر بہت دُور تک بہتی چلی گئی تھی اور اس سے شاخین کاٹ کے باغ مین ہر چہار طرف چشمہ اور آبشار جاری کئے گئے تھے - جا بجا اونچے خوشنما برج بنے اور ہر برج پر نہر چڑہتی تھی اور چڑھ کے پھر نشیب مین چلی جاتی تھی - اسکی تیاری اور درستی کا کام ایسے چالاک ہوشیار اور چابکدست مہندسون کے سپرد کیا گیا تہا کہ چودہ مہینے مین نہر بن کے تیار ہوگئی - اور پانی جاری ہوگیا جس روز پانی نہر مین لایا گیا اور چشمون اور آبشارون کی روانی کا سلسلہ قائم ہوگیا اُس روز جمادی الثانی کی پہلی تاریخ تھی اور ہجرت نبوی کا تین سو اُنتیسوان (۳۲۹) سال تہا - اس روز تیاری نہر کی خوشی مین ناصر نے قصر ناعورہ مین ایک عظیم الشان اور جلیل القدر دعوت کی جسمین اکثر

روساے اسپین اور عام اہل قرطبہ شامل تھے - اس مجمع عام مین مہندسون اور کاریگرون کو اُنکے حسن خدمت کا صلہ دیا گیا اور سلطنت کی جانب سے اُنکی قدر منزلت دوبالا کی گئی -

خاص قصر زہرا مین دو اور مطلا و منقش حوض تھے - یہ حوض نہایت ہی خوشنما اور خوبصورت بنے تھے اُنمین سے بڑے حوض کی نسبت مورخین کہتے ہین کہ ناصر کے دربار کا بہت بڑا مہندس احمد یونانی اُسکے سامان کو قسطنطنیہ سے لایا تھا - اور چھوٹے حوض کو وہی احمد یونانی شام کے ایک قدیم کنیسہ سے لے آیا تھا - لوگون کا بیان ہے کہ چھوٹا حوض اس درجہ خوشنما بنا تھا کہ بادشاہ نے بہت کوشش کی مگر صرف خوشنمائی کی وجہ سے کوئی اُسکی قیمت نہین تجویز کر سکا - حوض ابتدائہً کھاڑ اُکھاڑ کے کئی جگہ نصب کیا گیا اور آخر خلیفہ ناصر نے اُسے اپنے خاص خواب گاہ کے مشرقی کمرے مین نصب کیا - اُس کمرے کا نام "مونس" تھا - کمرۂ مونس مین نصب ہونے کے بعد یہ اور لطف پیدا کیا گیا کہ اُس کے اوپر چارون طرف خالص سونے کی بارہ مورتین کھڑی کی گئین جن پر موتی اور بے بہا جواہرات جڑے ہوئے تھے خاص قرطبہ مین صنعت و دستکاری کا ایک بہت بڑا کارخانہ تھا "دار الصناعۃ" یہ مورتین اسی کارخانہ مین تیار ہوئی تھین - ان مورتون کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ ایک طرف شیر ہرن اور گھڑیال کی تصویرین تھین اور انکے مقابل مین دوسری طرف اژدہے عقاب اور ہاتھی کی مورتین قائم تھین - اِدھر اُدھر کے دونون پہلوون مین سے ایک جانب کبوتر شاہین اور طاوس تھے اور اُنکے مقابل مین دوسرے پہلو پر مُرغ چیل اور باز نصب تھے - قطع نظر اُس طلائی کام اور اُس مرصع کاری کے جو قیمت مین سلطنتون کے خراج سے زیادہ تھی یہ بہت بڑی صنعت تھی کہ ان سب جانورون کے مُنہ سے ہر وقت حوض مین پانی گرا کرتا تھا - اور پھر لطف یہ کہ

پانی اسقدر کبھی نہین بڑہتا تھا کہ حوض سے چھلک جائے۔ کیونکہ حوض ہی سے جانورون مین پانی پہنچتا تھا
تیاری کے بعد بادشاہ نے قصر زہرا کو اپنا مستقر قرار دیا۔ اگرچہ انُ لونکی لڑائیون اور بعض بغاوتون نے خلیفۂ ناصر کو قصر زہرا مین کبھی اطمینان سے نہین بیٹھنے دیا مگر پہر بھی حتے الامکان اُس نے کوشش کی اپنی زندگی کا زیادہ تر حصّہ اس بے بدل قصر اور پری جمال معشوقہ زہرا کے پہلو مین بسر کرے۔ تیرہ ہزار سات سو پچاس نوجوان خاص قصر زہرا کے ملازم تھے۔ جو مختلف خدمتون پر مامور تھے کہتے ہین کہ ان نوجوانون مین تین ہزار سات سو ستاسی صقلی والے تھے۔ اور ان نوجوانون کے علاوہ چھ ہزار تین سو چودہ پریوش لڑکیان تہین جو ہروقت اس شاہی قصر کی آراستگی مین سرگرم رہتی تہین۔ کانڈی لکھتا ہے کہ قصر الزہرا کے خاص شاہی نشست گاہ کے کمرے مین علاوہ اور تمام صناعیون کے ایک یہ صنعت تھی کہ کمرے کے درمیان مین زبرجد کا ایک نہایت نازک و نفیس فوارہ تہا جس کی چوٹی پر ایک سونے کی بطھ تہی اور انسانی حیرت خیز کاریگری کی خبر دیتی تھی۔ اس بط کی نسبت بیان ہے کہ قسطنطنیہ کی بنی ہوئی تھی۔ اور اس فوارے کے محاذات مین اوپر دہ بے بہا اور بے مثل موتی آویزان تہا جس کو شہنشاہ یونان نے خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر الدین اللہ کی خدمت مین نذر کیا تہا وہ اونچا اور سب سے بلند چبوترہ جہان سے آبشارون کی روانی۔ درختون کی سرسبزی۔ پھولون کی شادابی فوارون کی روانی۔ اور عمارتون کی آب وتاب کا سمان نظر آتا تھا اُس پر ایک نفیس بنگلہ تہا۔ اس بنگلے مین اکثر اوقات خلیفہ جب کسی محنت اور کسی کام سے تھک کے آتا تہا آرام کیا کرتا تھا۔ بنگلہ کی چھت سنگ مرمر کے ستونون پر قائم تھی اور انُ ستونون پر سنہری گلکاری بنی ہوئی تھی۔ کہتے ہین کہ اس بنگلے مین

سنگ سماق کا ایک بڑا حوض رکھا تھا جسمین پارہ بھر دیا گیا تھا جو ترکیبون سے ایسا متحرک کر دیا گیا تھا کہ خود بخود اسمین لہرین اُٹھتی تھین اور ہر وقت حرکت کرتا رہتا تھا۔ اس متحرک پارے پر جب آفتاب یا ماہتاب کی شعاعین پڑتی تھین عجیب حیرت انگیز سمان نظر آتا تھا اور اس کی آب و تاب سے آنکھین خیرہ ہوجاتی تھین سب طرف دروازون پر ریشم اور روپہلے سنہرے پردے آویزان رہتے تھے ان پردون پر جا بجا ایسے بیل بوٹے اور ایسی تصویرین بنی ہوئی تھین کہ دیکھنے والے کو اصل باغ اور زندہ جانورون کا دھوکا ہوتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ اس قصر اور اُسکے گرد کے باغ مین وہ تمام سامان فراہم تھے جو کسی بڑے سے بڑے جلیل القدر اور صاحب جبروت شاہنشاہ کے خوش کرنے کے لئے مہیا کئے جا سکتے۔

مدینۃ غرناطہ مین اس قصر کے گرد اور بہت سی عمارتین بنوائی گئین تھین ایک ٹکسال تھی اور خاص شاہی گارد کے لئے بہت سی بارکین تعمیر کی گئی تھین۔ خلیفہ الناصر الدین اللہ کے گارد مین بارہ ہزار جوان تھے۔ چار ہزار اسکلیو دنیا کے رہنے والے تھے جو پیادہ تھے۔ اور قصر کے اندر حاضر رہتے تھے باقی آٹھ ہزار مین چار ہزار افریقہ کے حبشی اور چار ہزار خاص اندلسی جوان تھے جو سوار تھے۔ ان پلٹنون اور رسالون کی سرداری کے لئے خاص شاہی خاندان کے شاہزادے اور معزز امرا و شیوخ اندلس و افریقہ منتخب کئے جاتے تھے۔ ہر رسالہ اور ہر پلٹن کے لئے الگ بارک بنی ہوئی تھی جنمین ہر قوم کے لوگ الگ الگ رہا کرتے تھے سوا اُن اوقات کے جب خلیفہ خود میدان جنگ کا قصد کرے اور کسی حال مین یہ فوج پائے تخت سے حرکت نہین کرتی۔

قصر زہرا کے بعد جس عمارت کی جانب خلیفہ ناصر الدین اللہ نے توجہ کی وہ مدینہ زہرا کی عالیشان مسجد جامع زہرا تھی۔ اس مسجد کی تعمیر مین بھی مصارف کا جتنا بڑا بار

عبدالرحمن نے اپنے سر لیا تھا شاید اور کوئی بادشاہ نہ لے سکا ہوگا - ابن فرضی اور
دیگر مورخین لکھتے ہین کہ جامع زہرا جس روز بننا شروع ہوئی اُس روز سے
اختتام اور تیاری تک روزانہ ایک ہزار کاریگر کام بناتے رہے جنمین سے تین سو
معمار دوسو بڑہئی اور پانسو مزدور اور مختلف قسم کے کاریگر تھے - جامع زہرا مین
پانچ درجے قائم کئے گئے تھے جن کی خوبصورتی عجیب وغریب تھی - تمام مسجد مین سنگ
مرمر کا فرش تھا اور وسط صحن مین ایک فوارہ تھا جس سے ہر وقت پانی جاری
رہتا تھا - یہ مسجد ستانوے گز لمبی اور اُنسٹھہ گز چوڑی تھی - گنبد زمین سے چالیس ۴۰
گز بلند تھا - اور گنبد کا قطر بیس گز تھا - خاص قرطبہ کی جامع مسجد جس کا حال کسی
موقع پر ہم بیان کرینگے جس وقت خلیفہ ہشام نے اُسکو تعمیر کرایا ہے تمام
لوگون نے دعوے کر دیا تھا کہ دنیا بھر کی مساجد شان وشوکت اور خوشنمائی
اور عظمت مین اُس سے دب گئین مگر کانڈی لکھتا ہے کہ جسوقت یہ مسجد مدینہ زہرا
مین تعمیر ہوئی سب نے اعتراف کر لیا کہ اس نے اپنی رفعت وشان کے آگے
اُسکو بھی دبا لیا - جامع زہرا کی ایسی عظمت کا حال سننے کے بعد جب لوگ یہ
سینگے کہ یہ مسجد کسقدر جلد بنکر تیار ہوگئی تو لوگون کو خلیفہ کی سرگرمی اور کاریگرون
کی جانکاستی پر حیرت ہو جائیگی - باوجود تمام خوبیون اور مضبوطیون کے یہ مسجد صرف
اڑتالیس ۴۸ دن مین بنکے تیار ہوگئی تھی - تعمیر مسجد کا کام جب تمام ہوگیا تو عبدالرحمن
نے خیال کیا کہ ایسی عالیشان مسجد کے لئے ممبر بھی اُسی شان وشکوہ کا چاہئے
اُسکے حکم سے ممبر کی تیاری مین بڑی بڑی دستکاریان اور اعلیٰ درجہ کی عقل آرائیاں
صرف کی گئین اور ۲۳ - شعبان ۳۲۹ھ کو ممبر لاکے اپنے مقام مین رکھا گیا اسدن
کی پہلی شام کو مغرب کی نماز جماعت سے قصر زہرا مین ادا کی گئی - یہ پہلی جماعت تھی
جو اس مسجد مین اُس پاک خدائے واحد کی عبادت کرتی ہوئی نظر آئی -

قاضی ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن ابی عیسٰی نے جو اس زمانے کے مشہور اور مرجع خلائق مقتدا تھے امامت کی۔ دوسرے روز جمع کو ممبر لا کے رکھا گیا اور قاضی صاحب ممدوح نے اس ممبر پر کھڑے ہو کر جمعہ کا خطبہ پڑہا۔ جو پہلا خطبہ تہا۔ اور خود خلیفہ ناصر الدین اللہ نے اُنکے پیچھے اس مسجد مین پہلے پہل نماز جمعہ ادا کی۔ خلیفہ ناصر الدین اللہ کو ان عمارتون کی تیاری کا ایسا شوق تہا کہ اپنے بیٹے حکم کے سوا وہ ان کامون کا اہتمام اور کسی شخص کے ہاتھ مین نہ دے سکا۔ اول سے آخر تک حکم ہی کا انتظام رہا۔ جو خود بہی عمارتون کا نہایت شائق تہا اور واقعی ناصر نے نہایت سچا اندازہ حکم کے شوق کا کیا تہا کیونکہ عبد الرحمن جب مدینہ زہرا کے کام کو ادہورا چھوڑ کے اور تکمیل عمارت کی حسرت دلمین لیکے راہی ملک عدم ہوا تو حکم نے اپنے ذاتی شوق کے جوش مین مرحوم باپ کی آرزوئین پوری کین اور مدینۂ زہرا کو ہر طرح سے آباد اور مکمل کر کے چھوڑا۔

خلیفہ عبد الرحمن الناصر الدین اللہ نے جب دیکہا کہ اب زندگی کا آخر عہد ہے اور موت کے فرشتے سفر عالم آخری کا تقاضا کر رہے ہین۔ اگرچہ اپنے تعمیر کیے ہوئے قصر تمام اطراف اسپین مین پہیلے ہوئے دیکھے اور ہر عمارت اور ہر جامع کو خیال کیا تو ایک قوی کشش سے اس شوق مین پایا کہ وہ اُسے اپنی طرف بُلا رہی ہے مگر مدینۃ الزہرا اور اُسکے قصر کی کشش سب سے بڑہی ہوئی تہی۔ اولو العزمی کے حوصلہ اور سپہگری کے کام چھوڑ دئے اور قصر زہرا مین گوشہ نشین ہو گیا۔ اُسکی یہ زندگی بہی عجب لُطف اور سرور کی زندگی تہی۔ اپنے ولیعہد حکم کو سلطنت کا مختار کر دیا اور خود ایک مختصر اور منتخب صحبت مین زندگی کی پچہلی گہڑیان گذارنے لگا۔ اس صحبت کا رکن اعظم سلیمان بن عبد الغفار تہا جو کسی زمانے مین اسپین کا بہت بڑا نامور سپاہی تہا۔ اور جسکی شجاعت اور جُرأت نے خلافت اندلس کو اپنا ممنون احسان بنا لیا تہا۔ اس زمانے مین سلیمان نے

دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔ بالکل فقیرانہ زندگی بسر کرتا تھا اور صرف اپنی نجات کے خیال مین محو رہتا تھا۔ بکری کی کھال اوڑھتا تھا۔ ننگے پانون پھرتا تھا اور خدا لایزال کے جلال کو ہر وقت اپنی آنکھون سے دیکھا کرتا تھا۔ عبدالرحمن کو بھی سلیمان کی صحبت نے اگرچہ بالکل درویش اور باخدا بنا دیا تھا مگر قصر زہرا۔ اور تیر صحبت کی چندپری جمال لڑکیون کی وجہ سے یہ بھی صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک زبردست شاہنشاہ ہے اُسکی خدمت مین جو چند عورتین تھین اُن مین سے ایک تو محسنہ تھی جو تمام خانگی معاملات کی کارفرما تھی۔ ایک عفیہ تھی۔ جو اس عہد کی ایک مشہور مصنفہ تھی۔ اور عبداللہ الراعی کی بیٹی تھی۔ اور اُسکے اشعار و قصائد سے بادشاہ اکثر اپنا دل خوش کیا کرتا تھا جنمین عاشقانہ جذبات کے ساتھ علم کے اعلی خیالات بھی پائے جاتے تھے۔ احمد بن قاسم کی بیٹی عائشہ کے اشعار بھی بادشاہ اکثر سُنتا تھا اور بے اختیار ہو ہو کے داد دیتا تھا۔ عائشہ قرطبہ کی ایک کنواری لڑکی تھی جسکی مورخین بہت تعریف کرتے ہین اور کہتے ہین کہ تین باتون مین وہ اسپین کی کل عورتون سے فوق لے گئی تھی یعنی پاکدامنی حُسن و جمال اور علم و فضل مین اُسکے برابر اندلس بھر مین کوئی لڑکی نہ تھی۔

آخر داعی اجل نے لبیک کہی۔ اور عشرتکدۂ زہرا بزم ماتم بنگیا۔ ۲۔ ماہ مبارک رمضان ۳۵۰ھ مین سہ شنبہ کے روز رحمت حق نے بڑھ کے خلیفہ ناصر الدین اللہ کو اپنی گود مین لے لیا۔ نامور خلیفہ نے پچاس برس چھ مہینے اور تین دن سلطنت کر کے بہتر برس کی عمر مین سفر آخرت کیا۔

اُسکا بیٹا حکم جو امور سلطنت اور شاہی اُولوالعزمیون مین ہمیشہ مشیر کار رہتا تھا دوسرے روز تخت خلافت پر بیٹھا۔ حکم تخت پر بیٹھنے کے بعد المستنصر باللہ حکم بن عبدالرحمان الناصر کے لقب سے یاد کیا گیا۔ حکم نے اپنے زمانے مین

علمی ترقیون کی طرف توجہ کی۔ اور اُسی کی کوششون سے علمی دنیا مین بھی خلافت اسپین خلافت بغداد کی حریف بنگئی۔ اُس کے حالات بھی ہم کسی اور موقع پر ظاہر کرینگے۔

ابن بطوطہ

یہ عجیب و غریب مسافر ابو عبد اللہ محمدؒ بن عبد اللہ بن محمدؒ بن ابراہیم المعروف بہ ابن بطوطہ ہے۔ لیکن ممالک مشرقی کے لوگ اسے شمس الدین کے نام سے یاد کرتے ہین۔ یہ شخص مُلک مراغہ کے شہر طنجہ مین پیدا ہوا تھا۔ مراغہ جسے آب انگریزی مین مراکو کہتے ہین افریقہ کے انتہائی حدود پر واقع ہے۔ وہ مشہور آبنائے جسے آبنائے جبرالٹر کہتے ہین جو شرقاً و غرباً بحیرہ روم کو بحر اعظم مغرب یعنی اٹیلنٹک اوشن سے ملاتی ہے اور شمالاً و جنوباً یورپ کو افریقہ کے پاس پہنچاتی ہے اُسکے جنوبی ساحل سے مراغہ کی سرزمین شروع ہوتی ہے اور شمالی ساحل پر اسپین یعنی قدیم اندلوسیہ کی زمین ہے۔ دونون ساحلون پر ایک دوسرے کے مقابل دو شہر آباد ہین یورپ مین یعنی شمالی ساحل پر شہر جبرالٹر واقع ہے۔ جو اب تو جبرالٹر ہے مگر کسی زمانے مین جبل الطارق تھا اور شمالی ساحل یعنی مراغہ کی سرزمین پر ایک آباد وسیع اور قدیم شہر ہے جسکو انگریزی مین ٹنجیر اور عربی مین طنجہ کہتے ہین یہی شہر طنجہ جو پُرانی دنیا کی آخری حد پر واقع ہے ابن بطوطہ کا مولد ہے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ مین نے صرف بہ نیت حج بیت الحرام اور زیارت قبر رسول علیہ السلام جمعرات کے روز ۲ رجب ۷۲۵ھ کو اپنے پیارے وطن طنجہ کو چھوڑا۔ اعزا و اقربا مین سے ہر زن و مرد کی مفارقت اپنے اوپر گوارا کر لی اور اس طرح وطن سے نکلا جسطرح چڑیا اپنے آشیانے سے اُڑ جاتی ہے۔ میرا سن اُسوقت بائیس برس کا تھا اور مان باپ بقید حیات تھے۔ جنھون نے نہایت دلسوزی سے آنسو

بہا بہا کے اور کلیجے پر صبر کی سلیں رکھ رکھ کے مجھے رخصت کیا میں نے اُنکی مفارقت کا داغ سینے میں لیا اور وطن کو خیرباد کہی"

ابن بطوطہ کا سفر معمولی حاجیوں کا سفر نہ تھا۔ یہ اُولوالعزم مسافر جو ملک راستے میں پڑے اُنکو بخوبی دیکھتا بھالتا ہر شہر کی معزز سوسائیٹیوں کو پرکھتا اور گاؤں گاؤں پھرتا یا یوں کہنا چاہیئے کہ ہر روز نیا دانہ کھاتا اور نیا پانی پیتا روانہ ہوا۔ الجیریا۔ ٹونس طرابلس۔ اور برقا کے مرغزاروں کی ہوا کھاتا ہوا مصر میں پہنچا۔ مصر میں عرصہ تک شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھر کے سرزمین شام میں پہنچا۔ شام میں بیت المقدس اور تمام مقامات کا سفر کرتا ہوا ایشائے کوچک میں داخل ہوا۔ اس مُلک کے جنوبی اضلاع کی سیر سے خوب سیر ہو کے کوہ لبنان اور بعلبک ہوتا ہوا شہر دمشق میں آیا دمشق کا حال اُس نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے جو اس مضمون کے ذریعے سے ہمارے دوستوں کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ سردست ہم اجمالی طور پر ابن بطوطہ کے سفر کا حال بیان کرتے ہیں۔

دمشق سے نکلکے ابن بطوطہ ارض عرب سے برکتیں حاصل کرتا ہوا مدینہ طیبہ حضرت رسول علیہ السلام میں آیا۔ وہاں سے مکہ میں جا کے شریک حج ہوا۔ ابن بطوطہ کے دل میں بچپن سے سفر کا شوق تھا۔ پہلے تو صرف حج اور زیارت روضہ رسول علیہ السلام کی نیت تھی مگر اب خیالات ایسے وسیع ہو گئے کہ ساری دنیا کے سفر پر آمادہ ہو گیا۔ اور مکہ معظمہ سے خشکی کے راستے عراق عرب میں آیا وہاں سے تمام مشہور شہروں میں پھرتا ہوا ایران میں پہنچا۔ ایران میں خوب پھرا اسکے تمام مشہور شہروں کی سیر کر کے پھر عرب میں واپس آیا اور عدن سے جہاز پر سوار ہو کے جنوبی ساحل افریقہ کے شہروں کیطرف روانہ ہوا۔ زنجبار ہوتا ہوا [illegible] تک پہنچ گیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد ساحل عرب یمن [illegible] ہوتا ہوا گذرا اور خلیج فارس کی

طرف سے چڑھ کے ملک ایشیائے کوچک کی سیر میں پھر مشغول ہوا۔ غرضاً پورا ملک قطع کرکے بحر اسود کے سواحل پر گیا۔ پھر بلغاریہ میں جاکے قسطنطنیہ میں گیا قسطنطنیہ اسوقت تک مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں آیا تھا ایک مہینے سے زائد وہاں ٹھہر کے براہ خشکی سیدھا مشرق کی طرف چلا ماوراء النہر اور ایران ہوتا ہوا اور ہر ہر مقام کی سیر کرتا ہوا کابل و قندہار آ پہنچا۔ اسکے بعد اس نے ہندوستان کا سفر شروع کیا پنجاب سے لیکے بنگالہ تک اور شمال اور وسط ہند کے بہت سے مقامات کے علاوہ سندھ سے راس کماری تک اسنے ہر ہر شہر کی زیارت کی۔ سراندیپ کے تمام شہروں میں پھر پھرا کے سواحل کرناٹک سے گذرتا ہوا برہما میں داخل ہوا برہما کی سیر سے خوب سیر ہو کر جاوا اور جزائر چین میں پھرتا رہا۔ پھر خاص چین میں گیا اور وہاں سے واپسی کا قصد کرکے عرب ہوتا ہوا اور وسط افریقہ سے گذرتا ہوا مراغہ میں پہنچا وطن میں پہنچ کے ابن بطوطہ نے اپنا سفرنامہ مرتب کیا اور ایک ایسی عمدہ کتاب اسلامی کتب خانوں کی زیب و زینت کے لئے مرتب کردی کہ اسوقت تک دنیا اسکی نظیر سے خالی تھی۔

نہیں اسلام ہی کی لائبریری نہیں دنیا کی کل لائبریریاں اس قسم کی کتاب سے اسوقت تک خالی تھیں۔ اگرچہ اب کچھ تو بوجہ ذرائع سفر میں انتہا سے زیادہ سہولت پیدا ہو جانے کے اور کچھ بباعث عام ذوق سفر بڑھ جانے کے یورپین لوگوں کے سفر زیادہ وسیع معلوم ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ابن بطوطہ کے سفرنامے کی وقعت کو کوئی نہیں پا سکتا۔ اول تو قدیمی طور سے قطع منازل کرنے اور ہر ہر گاؤں میں اپنے اختیار کے موافق قیام کرنے سے جو کچھ تجربہ اور جو لطف سفر ایک قدیم مسافر کو حاصل ہوسکتا تھا وہ آج ان دنوں کے کسی مسافر کو نصیب نہیں ہوسکتا اور ریل اور ڈاک کے جہازوں پر سفر کرنے کی صورت میں ممکن نہیں اور قطع نظر اسکے سفرنامہ ابن بطوطہ کو اس لئے

اور زیادہ تر ترجیح ہے کہ وہ آج سے پانسو برس پہلے کے حالات دنیا کا نمونہ دکھاتا ہے جسپر گمنامی کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور جس عہد کی تاریخ کا ایک ایک جملہ (اگر نیا ہو) تو سونے کے مول خریدا جاتا ہے۔ اور موجودہ تمام سفرنامے عام اس سے کہ وہ کسی بادشاہ کے لکھے ہوں یا وزیر کے یا کسی معمولی شائق سفر کے اُن سب کے ذریعہ سے جو کچھ حالات معلوم ہو سکتے ہیں وہ چودھویں صدی ہجری پر محدود ہیں۔ مگر واقعی ہماری قوم سے جہاں اُولوالعزمی جاتی رہی وہاں اُولوالعزمی کے کارناموں کی قدر بھی جاتی رہی۔ اِسکا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ سفرنامہ ابن بطوطہ کی ایسی کتاب پہلے فرانس والوں نے بہم پہنچائی اور ۱۸۵۸ء میں پہلے پہل مع فرنچ ترجمہ کے پیرس دارالسلطنت فرانس میں طبع ہوئی۔ جسکی نقل اب تقریباً بیس (۲۰) برس ہوئے مصر میں چھپی ہے۔

مسلمان اپنے خیال میں سعدی شیرازی کے سفر کو اپنے قومی مسافروں کی اُولوالعزمی کی انتہا سمجھتے ہیں۔ کبھی انکے خیال میں بھی نہ آیا ہوگا کہ ابن بطوطہ کے ایسے مسافر اُن کی قوم میں گذر چکے ہیں۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں یہ سب سے بڑا کمال کیا ہے کہ اپنے الہامی انکشاف سے اُس نسل کے مذاق کو سمجھہ گیا جو چار پانچ سو برس کے بعد آنیوالی تھی۔ دیگر عربی مورخین کی طرح اُسنے صرف بادشاہ اور وزیر کی داستانیں نہیں لکھی ہیں بلکہ جس مقام پر پہنچا ہے وہاں کی اخلاقی حالت ملکی عادات مذہبی رسوم پر خوب غائر نظر ڈالی ہے اور اسی قسم کے حالات سے اپنے سفرنامے کو مرتب کیا ہے۔

مثلاً جب غرۂ محرم ۷۳۴ھ کو پنجاب میں پہنچا اور اُن تمام اضلاع میں جنکو دریائے اٹک سیراب کرتا ہے سیر کرتا ہوا سواحل سندھ کی ہوا کھانے لگا ہے تو اُس نے وہاں کے خاندان کو خوب غور سے دیکھا۔ اپنے سفرنامے میں اُس نے اُس عربی

نسل کا حال لکھا ہے جو تمام امیہ کے عہد میں آکے سندھ کے بلاد میں آباد ہوئی تھی۔ یہ بھی بتایا ہے کہ قدیم عربی اسلامی رسوم سے وہ لوگ کس قدر ہٹ گئے ہیں اور ان پر ہند کی آب و ہوا نے کیا اثر کیا ہے۔ پھر وہ دہلی کی طرف روانہ ہوا ہے اور انتظام ملکی اور ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے اخلاقی حالت سے تجربے کے مختلف سبق لیتا گیا ہے۔

یہاں ہندو عورتوں کے ستی ہونے کی رسم نے اُسے نہایت ہی حیرت و عبرت میں ڈالدیا ہے کئی مرتبہ اُسنے خود جا کے عورتوں کے ستی ہونے کا تماشا اپنی آنکھ سے دیکھا۔ ابن بطوطہ جسوقت ہندوستان میں آیا ہے اس وقت سلطان شاہ محمد ابن سلطان غیاث الدین تغلق ہندوستان کا فرمانروا تھا جسکے دربار تک ابن بطوطہ کی رسائی ہوئی تھی اور نہایت قدر و منزلت کی گئی تھی۔

ابن بطوطہ کے بیان سے ایک امر ایسا معلوم ہوتا ہے جس کی طرف ہمارے عام احباب درکنار ان لوگوں کا خیال ہی کبھی نہ گیا ہوگا جنکو تاریخ میں بصیرت ہے وہ یہ کہ دُنیائے اسلام جو مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر اسکے اجزا آج ایسے پریشان نظر آتے ہیں کہ ایک دوسرے کے حالات سے کبھی مطلع نہیں ہوتا اس عہد میں یہ دُنیا یوں بے تعلق نہ تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج جبکہ دُخانی جہازوں اور ریلوے ٹرینوں نے عالم کے ہر ہر گوشے کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے ایک ملک کے مسلمانوں کو دُوسرے ملک کے مسلمانوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ ہندوستان میں کون جانتا ہے کہ مراکش میں کیا ہوتا ہے۔ طرابلس والے کیا کر رہے ہیں۔ ٹونس پر کیا مصیبت پڑی ہے۔ الجیریں (جسے عربی میں الجزائر کہتے ہیں) کے مسلمان کس خیال میں ہیں زنجبار والے کیسے ہو رہے ہیں۔ [illegible] برہما اور چین کے اہل اسلام کے کیا خیالات ہیں۔ اور جس طرح ہم لاعلمی کی کوٹھری میں بند ہیں اسیطرح ان مذکورہ مقامات

سے لوگ بھی ہمارے حالات سے بے خبر ہونگے۔ مگر کتنی بڑی حیرت کی بات ہے کہ پانسو برس پیشتر کا زمانہ جب نہ یہ دودی جہاز تھے۔ نہ یہ ریل تھی اور نہ یہ تار برقی کا سلسلہ قائم تھا ایسا مہذب تھا کہ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملکوں کی سیریں کرتے تھے اور رشتہ اخوت اسلامی کو روز بروز زیادہ مضبوط کرتے تھے۔ ابن بطوطہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص ہندوستان میں غرناطہ اور قرطبہ کے بعض بعض لوگ موجود تھے۔ اور سفر اُنکی نظر میں ایک ایسی چیز تھا کہ بخوف خطر ہر چہار طرف پھیل جاتے تھے۔ مثلاً لکھتا ہے کہ جب میں اسکندریہ میں امام برہان الدین اعرج سے ملا جو وہاں کے مشہور اور اہل دل ائمہ میں سے تھے اگرچہ اُسوقت تک میرے دل میں سوا حج اور زیارت تربت رسول صلعم کے اور کسی سفر کا خیال بھی نہیں پیدا ہوا تھا مگر انھوں نے میری سیاحت پسند طبیعت کا اندازہ کرکے یا اپنے مکاشفہ کے علم سے مطلع ہوکر کہا "غالباً دُور دُور کے ملکوں تک تمہاری رسائی ہوگی اور دنیا کے ہر ہر کونے کی تم سیر کروگے۔ اگر ایسا ہو تو میرے بھائی فریدالدین کو ہند میں اور میرے بھائی رکن الدین کو سندہ میں اور میرے ہمنام بھائی برہان الدین کو چین میں میرا اسلام پہونچا دینا" ابن بطوطہ ان تینوں بھائیوں سے ملا ہے۔ بلکہ فریدالدین کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ شہنشاہ دہلی کے استاد تھے اور علمائے اندلس میں انکو بڑا رتبہ تھا قدیم مشہور شہر اجودھن جاگیر میں دیا گیا تھا اور میں اجودھن میں جا کے انکی ملاقات سے محظوظ ہوا اور لکھتا ہے کہ دمشق کی مشہور اور عالیشان مسجد جامع بنی امیہ کے لقب سے یاد کی جاتی ہے اُسمیں مالکیوں کے امام فقیہ ابو محمد بن ابی الولید بن الحاج التجیبی تھے جن کا خاندان تو غرناطہ کا تھا مگر پیدا وہ قرطبہ میں ہوئے تھے اور آخر میں دمشق کی سکونت اختیار کرلی تھی۔ پھر کہتا ہے کہ میں نے دمشق میں جن جن علما سے سند حدیث حاصل کی انمیں سے سب سے زیادہ مستند اور متبحر شہاب الدین احمد

معروف بابن شحنہ حجازی تھے۔ ماہ مبارک رمضان ۲۶ سنہ میں کتاب صحیح بخاری چوده جلسوں میں میں نے ابن شحنہ ممدوح کی زبان سے سُن کے سند حاصل کی اور ابن شحنہ کو مشہور مورخ شام امام حافظ علم الدین ابومحمد قاسم بن محمد یوسف کے تلمذ کا فخر تھا۔ اور حافظ علم الدین ممدوح اسپین کے شہر اشبیلیہ کے رہنے والے تھے۔ جنہوں نے آخر سرزمین شام میں توطن اختیار کیا۔ اور بے مثل تاریخ شام مرتب کی اسکے علاوہ تربت رسول صلعم کے خدام میں اُس نے ایسے کئی لوگوں کے نام بتلائے ہیں جو غرناطہ کے رہنے والے تھے اور جنکو سرزمین یورپ سے خدا کے

حبیب خاص پیغمبر عرب صلوات اللہ و سلامہ علیہ کے روضہ مطہر کی خدمت کے لئے منتخب کیا تھا۔

ابن بطوطہ نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے جس سے اُن دنوں کے دینی جوش اور نیز بادشاہوں کی قدردانی کا اندازہ ہونے کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوگا کہ ایک غرناطہ کا رہنے والا کیونکر ہندوستان میں آیا اور شاہی دربار میں پہنچا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ میرے ہمراہی غرناطہ کا ایک خوش اوقات اور پاک نفس فقیر علی بن حجر زیارت مدینۃ الرسول سے شرفیاب ہوا تھا۔ اتفاقاً پہلی شب کو اُس نے خواب میں منادی غیب کی زبان سے یہ دو شعر سُنے۔

"ہنیئاً لکم یا زائرین ضریحہ — امنتم بہ یوم المعاد من الرجس"

یعنی اے اُس رسول پاک کے روضہ مقدس کی زیارت کرنے والو تمہیں مبارک ہو کہ ببرکت اسی رسول کے روز جزا کو تم تمام خرابیوں سے امن اور نجات پا گئے۔

"وصلتم الی قبر الحبیب بطیبۃ — فطوبیٰ لمن یضحی بطیبۃ او یمسی"

تم ارض طیبہ میں روضہ حبیب خدا کی زیارت سے شرفیاب ہوئے۔ مرحبا اس شخص کو جسکی صبح یا شام ارض طیبہ میں ہو۔

یہ اشعار اُس نے صبح کو مجھسے بیان کئے۔ پھر میں تو دُنیا کے اور اطراف میں چلا گیا اور علی بن حجر جوار رسول ہی میں مقیم رہا۔ یہانتک کہ ۷۴۳ھ میں جب میں سرزمین ہند میں پہنچا تو اُس نے بھی اتفاقاً ہندوستان کا سفر کیا اور دہلی میں پہنچکے میرے پڑوس ہی میں اُترا۔ مجھے جب شہنشاہ ہند کے دربار میں جانے کی عزت حاصل ہوئی تو میں نے بادشاہ سے اس کا حال بیان کیا اور ان اشعار کو پڑھا۔ بادشاہ نے علی بن حجر سے ملنے کا شوق ظاہر کیا۔ اور مجھسے اصرار کیا کہ اسکو دربار میں لاکے حاضر کروں۔ جب علی بن حجر سلطان محمد تغلق کے سامنے آیا تو بادشاہ نے اس سے فرمایش کی کہ مدینہ طیبہ میں جو خواب دیکھا تھا اُسکو اپنی زبان سے بیان کرے۔ اُسکی زبانی یہ اشعار سُن کے سلطان بہت خوش ہوا۔ اور حکم دیا کہ انعام کے طور پر تین سو اشرفیاں اور ایک خاصہ کا گھوڑا مع تمام سامانوں کے اُسکو دیا جائے علی ابن حجر اسوقت سے ایک عمدہ مکان میں رہنے لگا۔ ان دنوں دہلی میں غرناطہ کا ایک متبحر فقیہ تہا جو جمال الدین مغربی کے لقب سے مشہور تھا اُسکو علی بن حجر نے اپنے مکان کے ایک حصہ میں اُتارا اور وعدہ کیا کہ اپنی بیٹی اُسکے عقد میں دیدیگا۔ ایک غلام اور ایک لونڈی مول لی جو ہروقت اُسکی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ اور باقیماندہ اشرفیوں کو ہر لحظہ اپنے سامنے رکھتا تہا کہ کوئی چرا نہ لے۔ اتفاقاً غلام اور لونڈی کا ہاتھ اشرفیوں تک پہنچ گیا اور لے کے چلدیئے۔ اس نقصان نے علی بن حجر کو ایسا صدمہ دیا کہ کھانا پینا چھوٹ گیا اور بیمار پڑ گیا۔ سلطان کو اسکی خبر ہوئی تو حکم دیا کہ تین سو اشرفیاں پھر دیدی جائیں مگر جب تک یہ خبر پہنچے پہنچے موت علی بن حجر کا کام تمام کر چکی تھی۔ علی بن حجر کے بعد جمال الدین مغربی مشہور فقیہ غرناطہ دہلی ہی میں رہا۔ بلکہ ایک مقام پر ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان میں آیا تھا۔ پھر یہیں اس نے شادی کرلی اور صاحب اہل و عیال ہوگیا۔

ابن بطوطہ نے ہندوستان اور خصوص شہر دہلی اور شاہی دربار کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔ جن لوگوں نے آجکل تاریخیں لکھی ہیں انہوں نے سلطان محمد تغلق کے حالات پر ایسے ریمارک کئے ہیں کہ اُنکی تحریر سے اُس بادشاہ میں ہرطرح کے عیوب اور بُرائیاں ثابت ہوئی ہیں۔ حالانکہ ابن بطوطہ جس نے اُسکے دربار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے نہایت آزادی سے دعوی کرتا ہی کہ اس بادشاہ میں اگرچہ بعض بہت بڑے نقصان تھے مگر اسمیں بہت سی خوبیاں بھی تھیں جو اُسکے پہلے اور بعد دُنیا کے کسی شہنشاہ میں نہ ہوئی ہونگی۔

دمشق کی جامع بنی اُمیّہ

ابن بطوطہ کہتا ہے کہ کوہ لبنان اور بعلبک ہوتا ہوا جمعرات کو نویں تاریخ ماہ مبارک رمضان کی ۷۲۶ھ میں دمشق پہنچا اور مالکیوں کے مدرسے میں جو مدرسہ شرابشیہ کے نام سے مشہور تھا اُترا۔

دمشق ایک ایسا شہر تہا کہ میرے طولانی سفر میں اس سے پہلے جتنے مقامات

میری نظر سے گذرے تھے سب مجھے ہیچ معلوم ہونے لگے - شہر دمشق کے ہر چہار طرف نہرین جاری ہین اور میوہ دار درخت گویا اُس کی آبادی کو اپنے جہرمٹ مین لئے ہوئے ہین - ایک نازک دماغ شخص کو اپنی تفریح کے لئے دمشق سے زیادہ کسی جگہ سامان فراہم نہین ملسکتا -

کہتا ہے کہ انہین باغون اور سبزہ زارون اور انہار کی وجہ سے اہل دمشق نے ہفتہ کا روز سیر و تفریح کے واسطے مخصوص کر لیا ہے اُس روز تمام کارخانون مین تعطیل ہو جاتی ہے اور سب لوگ شہر سے نکلکر باہر جاتے ہین اور دن بھر باغون مین پھر پھر کے نہرون کے کنارے بیٹھ بیٹھ کے اور ہوائے سرد کی خنکی سے لُطف اٹھا اٹھا کے رات گھرون مین واپس آتے ہین اور شاید انہین مرغزارون اور آبشارون نے شعرا کے دل مین وہ ولولے پیدا کئے کہ صدہا قصائد اور اشعار اس خوش سواد شہر کی تعریف مین کہہ ڈالے - ابن بطوطہ نے اس موقع پر بہت سے اشعار کے ایک شاعر ابوالحسن علی بن موسےٰ بن سعید الغنسی الغرناطی المدعو بہ نور الدین نے کہے ہین انکو ہم لکھے دیتے ہین - ناظرین ہماری خاطر سے پڑھ لین -

انا دمشق فیجنۃ + + نیستی بہا الوطن الغریب

دمشق تو جنت ہے - غریب الوطن یہان آکے وطن بھول جاتا ہے -

للہ ایام السبوت - + بہا و منظرہا عجیب

سبحان اللہ اسکے ہفتے کے دن! اس دن یہا نکا سین عجیب ہوتا ہے -

انظر بعینک ہل ترلے + الا محبًا او حبیب

اپنی آنکھہ سے دیکھہ - کچھ بھی نظر آتا ہے بجز عاشق اور معشوق کے ؟

فی موطن غنے الحمام + بہ علے رقص القضیب -

کسی مقام پر کبوتر نغمہ سرائی کر رہا ہے - نازک ٹہنیون کے رقص (لچکنے) پر

ؔ بلہ اتنا خیال رہے کہ کبوتر عرب کا بلبل ہے -

وغدت ازاہر روضہ + تختال فی فرح وطیب

اور اُسکے باغون کی کلیان جوش مسرت مین اپنے اوپر فخر کر رہی ہین

دمشق مین سب سے اول درجہ کی عمارت جامع مسجد ہے جو جامع بنی امیہ کے نام سے مشہور ہے ۔

ابن بطوطہ نے اپنے طرز بیان سے اسکی پوری تصویر دکہادی ہی ۔ تو ہمارے ناظرین کو معلوم ہوچکا کہ انسل مروانی نے دوسرے تاجدار امیرالمومنین ولید بن عبدالملک نے قیصر روم کے نام حکمنامہ بہیجکے قسطنطنیہ سے بارہ ہزار کاریگر بلوائے جنہون نے نہایت سرگرمی اور اعلیٰ لیاقت صرف کرکے اس مسجد کو تعمیر کیا تہا ۔ مگر باقی حالات بہی قابل سننے کے ہین جس مقام پر یہ مسجد بنائی گئی وہان ایک قدیم مشہور اور عالیشان کنیسہ تہا انتہائے خلافت صدیقی رضہ اور ابتدائے عہد صولت فاروقی مین جب شہر دمشق فتح ہوا تو ایک طرف سیف اللہ خالد بن الولید اپنی تلوار کے زور سے شہر مین داخل ہوئے اور دوسری جانب سے امین الامۃ ابوعبیدہ رضہ بن الجراح اہل دمشق سے معاہدہ کرکے صلحاً داخل ہوئے ۔ عین اس گرجے مین دونون اسلامی جماعتون کا اس صورت سے سامنا ہوا کہ ابوعبیدہ اور اُنکے ہمراہیون کی تلوارین میان مین تہین اور خالد اور اُنکے ہمراہی مجاہدین کی تلوارین برہنہ تہین اور اپنا جوہر دکہا رہی تہین ۔ خالد جہاد کرتے ہوئے کنیسہ مذکورہ کے نصف حصہ تک پہنچ گئے اور دوسری طرف سے نصف حصہ تک ابوعبیدہ صلحاً پہنچے ۔ سبحان اللہ وہ گروہ کتنا بڑا پابند عہد تہا کہ جسقدر حصہ لڑکے فتح کیا گیا تہا اُسکی مسجد بنالی اور جسقدر حصہ مین صحابہ صلحاً داخل ہوئے تہے وہ کنیسہ ہی باقی رکہا گیا ۔ فتح اور صلح کی اس سے عمدہ اور مہذب یادگار شاید مسلمانون کے سوا اور کسی قوم نے نہ چہوڑی ہوگی ۔ اسیوجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ اس مسجد کی ابتدا جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہی کے عہد سے ہی ۔ لیکن خلیفہ

ولید نے چونکہ از سر نو تعمیر کرائی اور مرمت مین اپنی پوری قوت صرف کر دی لہذا آخر زمانہ نے اُسیکی طرف منسوب کر دیا۔

اس مسجد کے تذکرے کے متعلق ہم نے یہ واقعہ بھی بیان کر دیا ہے کہ خلیفہ ولید نے تعمیر کرتے وقت مسیحیون سے درخواست کی کہ جسقدر روپیہ چاہین لے لین مگر باقی حصہ جو ابتک کنیسہ ہے اُسکو بھی مسجد مین شامل کر لینے کی اجازت دیدین۔ عیسائیون نے کسی طرح نہین منظور کیا بلکہ اُلٹے مشہور کر دیا کہ جو اس کنیسہ کو منہدم کرے گا وہ خدا اور اُسکے بیٹے کے غضب سے مجنون ہو جائے گا۔ ولید خلفائے راشدین کی ایسی بے نفسی کہان سے لاتا۔ اس جواب پر اُسکو غصہ آگیا۔ اُسنے زبان سے کہا وانا اول من یجن فی سبیل اللہ" مین پہلا وہ شخص ہون جو خدا کی راہ مین مجنون ہو جانے کو گوارا کرلے گا۔ اتنا کہکے اُس نے حکم دیدیا کہ کنیسہ مسمار کر کے مسجد مین شامل کر لیا جائے لیکن چند روز کے بعد عمر ابن عبد العزیز خلیفہ ہوا جسکو خلفائے راشدین کے بعد تمام شاہان اسلام کا فخر کہہ سکتے ہین۔ اُسکے حکم سے جسقدر کنیسہ غصباً مسجد مین شامل کیا گیا تھا وہ حصہ مسجد منہدم کر دیا گیا اور وہان پھر کنیسہ تعمیر ہوا

یہ مسجد طولاً مشرق سے مغرب تک تین سو ہاتھ لمبی ہے اور عرضاً سمت قبلہ سے مقابل کی دوسری دیوار تک دوسو ہاتھ چوڑی ہے۔ ہر چہار طرف چون ستون ہین اور وسط مسجد مین آٹھ ستون تو پختہ گچ کے بنے ہوئے ہین اور چھ ستون سنگ خام کے ہین جنپر عمدہ گل بوٹون کی مناسبت سے رنگ آمیزی کی گئی تھی مسجد کے سامنے صحن سے گذر کر بڑا گنبد ہے جسکو قبۃ الرصاص کہتے ہین۔ یہ سب سے بڑا گنبد ہے اور مسجد اور یہ گنبد سب کی مجموعی وضع ایسی بنی ہے کہ معلوم ہوتا ہے مسجد ایک عقاب ہے اور گنبد اسکا سر ہے۔ شہر بھر مین جس مقام سے دیکھیے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالیشان عقاب اڑ رہا ہے اور اپنا سر آسمان مین پیوست کیے ہوئے ہے۔ مسجد کی

صرف یہ وضع ہی ایک ایسی چیز ہے جسپر انسان جسقدر حیرت کرے زیبا ہے صحن سو گز کا ہے جس کے ایک طرف تو مسجد ہے اور تین طرف بڑے بڑے کمرے ہین ان کمرون مین سب ملا کے تینتیس ستون ہین اور چودہ پیلپائے ہین اور اس مسجد مین چوہتر شیشے لگے ہوے ہین جنکے مختلف رنگون اور جنکی رنگ آمیزیون سے ایک عجیب لطف پیدا ہوتا ہے بخصوص اُسوقت جب آفتاب کی شعاعین پڑتی ہین صحن مسجد کے متعلق تین قبہ (گنبد) ہین۔ ان مین سے مغرب کی جانب جو سب سے بڑا قبہ ہے وہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قبہ ہے۔ یہ قبہ سنگ مرمر کے آٹھ منقش اور مطلا ستونون پر قائم ہے۔ اور چھت مین سیسہ سے جڑائی کیگئی ہے مشہور ہے کہ اس جامع مسجد کی آمدنی اسی قبہ مین جمع ہوتی تھی اور لوگون کے بیان سے معلوم ہوا کہ سب ملا کے پچیس ہزار دینار کی سالانہ آمدنی تھی۔ دوسرا قبہ جو مشرق کی جانب ہے۔ اگرچہ وضع اور صورت مین بالکل قبہ عائشہؓ کے مثل ہے مگر اُس سے چھوٹا ہے وہ قبہ زین العابدین رضی اللہ عنہ کہلاتا ہے تیسرا درمیانی قبہ جو سنگ رخام کے چار منقش ستونون پر عجب خوشنمائی سے ہشت پہل بنایا گیا ہے اسکے نیچے لوہے کی جالی لگی ہے اور درمیان مین تانبے کا ایک فوارہ لگا ہے جسمین سے پانی چھت تک بلند ہوکے گرتا ہے صحن کے مشرق طرف ایک دروازہ ہے جسمین سے ہوکے ایک اور نہایت ہی خوشنما مسجد کو راستہ گیا ہے جسکو مشہد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہین۔ اور اُس دروازے کے مقابل مین ایک مقام ہے جسکی نسبت لوگون کا بیان ہے کہ جناب عائشہ صدیقہؓ نے وہان بیٹھ کے حدیث سُنی تھی۔ اور قبلہ کی جانب ایک بڑا کمرہ ہے جسمین امام شافعی نماز پڑھا تا ہے اور مشرقی حصۂ مسجد مین محراب کے سامنے ایک مقام ہے جہان قدیم متبرکات حفاظت سے رکھے ہین۔ وہ قرآن مجید جو جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے شام والون کے پاس بھیجا تھا اسی مقام

مین رکھا ہے۔ ہر جمعہ کو نماز کے بعد یہ خزانہ کھولا جاتا ہے اور لوگ اُس قرآن پر بوسہ دینے کے لئے ہجوم کرتے ہین۔ مسجد کی بائین جانب محراب صحابہ ہے جسکے بابت مورخین کا دعوی ہے کہ اسلام مین سب سے پہلے یہی محراب بنائی گئی تہی۔ اسی مین مالکیون کا امام نماز پڑہاتا ہے۔ اور داہنی جانب جو محراب ہے اُس مین حنفیون کا امام اپنی جماعت کے آگے نماز پڑہانے کو کھڑا ہوتا ہے اور اُسی کے برابر والی محراب مین حنبلیون کے امام کی جگہ ہے۔ اِسی مسجد کے متعلق تین عالیشان حجرے ہین۔ ایک جو مشرق کی طرف ہے وہ رومیون کا تعمیر کیا ہوا ہے اور اُسکا دروازہ مسجد کے اندر ہے اور اُسکے نیچے غسل و وضو کا مقام ہے۔ لیکن اسمین صرف وہی لوگ غسل یا وضو کر سکتے ہین جو مسجد مین اعتکاف کرین یا مسجد ہی مین رہتے ہون۔ دوسرا حجرہ جو مغرب کی طرف ہے وہ بہی رومیون ہی کی عمارت ہے۔ ہان تیسرا درمیانی حجرہ مسلمانون کا بنایا ہوا ہے۔ اس مسجد کے وسط مین دو ستونون کے درمیان جناب ذکریا علیہ السلام کی تربت ہے جسپر سیاہ حریر کی چادر پڑی رہتی ہے اور اُس چادر پر قرآن مجید کا یہ جملہ کڑہا ہوا ہے "یا ذکریا انا نبشرک بغلام اسمہ یحییٰ" اور یہ بہی مشہور ہے کہ اس مسجد کی اُس دیوار کو جو قبلہ کی جانب واقع ہے پیغمبر خدا جناب ہود علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا اور اُسی مین اُنکی قبر شریف بہی ہے۔

جامع دمشق کے چار دروازے ہین اور جو دروازہ سامنے کی طرف تھا اُسکی چھت پر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا جھنڈا نصب تھا جسکو لیکے اُنہون نے اس شہر کو اور دیگر بلاد کو فتح کیا تہا۔ اس دروازے کی دہلیز سے نکلکے دمشق کا بہت بڑا بازار تھا اور اسی بازار مین جناب معاویہ کا مکان تھا جسکو بنی عباس نے منہدم کر دیا اور معاویہ کے تمام متعلقین اور اعزا کے مکان بھی یہین تھے۔ اُن سب مکانون کی جگہ اب بازار ہے اور مشرقی دروازہ جو سب دروازون سے بڑا ہے بیرونی رخ پر ایک بڑا کمرہ ہے

جو چھہ طولانی ستونون پر قائم ہے اور وہین پر ایک زیارت گاہ ہے جسمین کہتے ہین کہ امام مظلوم سیدنا حسین علیہ السلام کا سر مبارک رکھا ہوا تھا۔ اور اس دروازے سے اُتر کے ایک چھوٹی مسجد ہے جو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی جانب منسوب ہے اور اسی دروازہ کے برابر ایک کمرے مین دن کی گھڑیون کے شمار کے موافق چھوٹے چھوٹے طاق ہین اور اُن طاقون مین شیشے لگے ہین۔ ان شیشون کے بیرونی رخ پر زرد رنگ دیا ہے اور اندر کی طرف سبز۔ اور یہ صنعت رکھی ہے کہ دن کی ایک ایک گھڑی جو جو گذرتی ہے وہ وہ ایک ایک طاق کے شیشے کا اندرونی سبز رنگ باہر کی طرف ہو جاتا ہے اور بیرونی زرد رنگ اندر کی طرف ہو جاتا ہے گویا یہ گھڑی ہے اور اسی سے دن کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مغربی دروازۂ جامع کے پہلو مین شافعیون کا مدرسہ ہے اور ہر دروازے پر ایک ایک بڑا کمرہ وضو کا ہے جسمین پانی جاری رہتا ہے اور ہر ایک مین سو آدمیون کے وضو کرنے کی جگہ بنی ہے۔

عمارت اور عالیشانی کے قطع نظر یہ امر لوگون کو حیرت مین ڈالدیگا کہ اس جامع مین تیرہ امام معین ہین جنمین سے چار تو اہل سنت کے چارون فریقون کی امامت کرتے ہین اور باقی پہلی جماعت کے بعد جو متواتر جماعتین ہوا کرتی ہین اُنکی امامت کیا کرتے ہین۔ اور ستر موذن ہین جو اذان کی خدمت پر مامور ہین۔ انکے علاوہ تقریبًا سات سو آدمی قران خوانی وغیرہ کے لئے مامور ہین اور ان سب کی خبرگیری اہل شہر اس شریفانہ برتاؤ سے کرتے ہین کہ کسی کو معلوم ہی نہین ہوتا کہ ان لوگونکو کہانا کون پہنچاتا ہے اور انکی بسر کیونکر ہوتی ہے۔ ہم مختصر شہر دمشق کے حالات نذر ناظرین کرتے ہین

شہر دمشق

اس شہر کی وجہ تسمیہ اس سے معلوم ہو سکتی ہے کہ مشہور مورخ حافظ

ثقہ ابو القاسم علی بن حسن عساکری نے صرف اس شہر کی تاریخ اسی جلدون مین لکھی
تھی جو آٹھ سو اجزا پر تمام ہوئی - اور شہاب الدین ابو محمد عبد الرحمن بن اسماعیل مقدس
شافعی نے اُسکا خلاصہ کئی جلدون مین کیا - خیال مین نہین آسکتا کہ اس شہر
کے حالات کسقدر وسیع تھے جنکو حافظ ابو القاسم نے آٹھ سو جز مین بیان کیا
تھا اور واقعی دمشق کی آبادی اور رونق اُس عہد کی مختلف شہادتون سے ایسی
ثابت ہوئی ہے کہ اُسکی تاریخ مین اس سے بھی زیادہ تطویل ہوتی تو نازیبا نہ خیال کیا
جاتا ابن بطوطہ جن دنون گیا ہے اُن دنون جامع بنی امیہ مین جس شان و شوکت
سے طالب علمون کو تعلیم دی جاتی تھی وہ موجودہ انہدام مدارس قومی کے مقابل
مین نہایت عبرت ناک معلوم ہوتی ہے - وہ کہتا ہے کہ مختلف فنون علم اور خصوص
حدیث کے مختلف حلقہ درس روزانہ قائم رہتے تھے - اساتذہ یعنی معلمین یا ائمہ
حدیث یا قرار قرآن مجید اونچی اونچی کرسیون پر صبح اور شام کو جلوہ افروز ہوتے
تھے اور کتب حدیث یا قرآن یا دیگر فنون کی کتابون کو بآواز بلند خوش الحانی کیساتھ
اپنے شاگردون کے حلقہ مین سُناتے تھے - قرار قرآن کا یہ قاعدہ تھا کہ مسجد کے
ستونون کے تکیہ لگائے بیٹھے تھے اور کم عمر بچون کو قرآن کی تعلیم دیتے اور تعلیم
یون دی جاتی تھی کہ اُن بچون کے آگے نہ قران مجید ہوتا تھا اور نہ وہ حسب دستور
قدیم لکھہ لیا کرتے تھے بلکہ اُستاد کی زبان سے سُنکے زبانی یاد کر لیا کرتے تھے لکھنے
کی تعلیم کے لیئے دوسرے اساتذہ تھے جو صرف لکھنا سکھاتے تھے اور اُن سے صرف
یہی خدمت متعلق رہا کرتی تھی - اسکے بعد ابن بطوطہ کہتا ہے کہ میرے زمانہ ورود مین
جو لوگ جامع دمشق مین بیٹھ کے درس دیا کرتے تھے اُنمین سے یہ دو چار شخص ایسے
ہین جنکی دور دور شہرت ہے اور اپنے علم و فضل اور نیز زہد و ورع کے اعتبار سے
مقتدائے عصر تسلیم کر لئے گئے ہین - [1] عالم صالح برہان الدین بن فرکح[2] الشافعی - امام

عصر نورالدین ابوالیسر بن الصائغ۔ امام[3] عالم شہاب الدین بن جہبل۔ اور امام[4] فاضل بدرالدین علی سخاوی مالکی۔ انہین امام نورالدین ابوالیسر کی نسبت کہتا ہے کہ جب جلال الدین قزوینی مصر مین قاضی القضاۃ کے عہدے پر مامور ہوئے تو وہ چونکہ امام نورالدین کے علم و فضل اور ورع و تقوی سے واقف تھے لہذا انکے لئے قاضی دمشق کا عہدہ تجویز کیا اور خلعت مع پروانہ قضا کے انکے پاس بھیجا لیکن اُنھون نے صاف انکار کر دیا کہ یہ خدمت مجھسے نہ سرانجام پا سکے گی اور اتنی بڑی ذمہ داریون کا کام مین اپنے سر نہین لے سکتا۔ امام نورالدین ابوالیسر کے انکار کرتے ہی امام عالم شہاب الدین کے دلمین خوف پیدا ہوا کہ کہین ایسا نہو یہ قضا کی مصیبت میرے سر ڈالی جائے اور اس خیال نے خوف کو اور ترقی دلادی کہ ایک شخص کے انکار کے بعد میرا انکار باعث ناراضی سلطنت ہوگا۔ بس اس خوف نے اس درجہ مجبور کیا کہ امام نورالدین کے انکار کرتے ہی وہ دمشق سے بھاگ گئے اور آخر مجبوراً علاءالدین قونوی قاضی دمشق مقرر کئے گئے۔

اس موقع پر یہ بھی بیان کرنا چاہیئے کہ اُن دنون دمشق مین کون کون علماء خدمت قضا کو سرانجام دیتے تھے۔ جلال الدین محمد بن عبدالرحمن قزوینی پہلے یہین شافعیون کے قاضی القضاۃ تھے اور یہان سے ترقی پاکر مصر مین طلب کئے گئے تھے۔ مالکیون کے قاضی دمشق مین شرف الدین ابن خطیب القیوم تھے جو اپنے علم و فضل کے علاوہ حسن صورت اور دولتمندی و ریاست کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔ اور یہ چونکہ شیخ الشیوخ صوفیہ تسلیم کر لئے گئے تھے اور خیالات تصوف ہی مین محو رہا کرتے تھے لہذا قضا کا کام اُنکی طرف سے نیابتہً شمس الدین بن تفصی ادا کیا کرتے تھے اور مدرسہ صمصامیہ مین بیٹھ کے انفصال مقدمات کرتے تھے حنفیون کے قاضی القضاۃ عمادالدین حورانی تھے۔ اور تمام شہر پر قاضی القضاۃ

حنفیہ کا ایسا رعب بیٹھا ہوا تہا اور اس سطوت و دبدبے کے آدمی تھے کہ مشہور ہوگیا
تہا اُن کے پاس جانے کی ضرورت نہین ہے کیونکہ جہان انسان نے انکا نام
سُن لیا اپنے ہی مقام پر خود اپنے دل سے انصاف کے ساتہہ اپنے جہگڑے کا
تصفیہ کر لیا کرتا تہا۔ اسی وجہ سے میان بی بی کے باہمی نزاعون کے مقدمات
عموماً اُنہین کے پاس جاتے تھے اور قاضی حنابلہ امام صالح عزالدین ابن مسلم
تھے جو یہان کے بڑے سن رسیدہ قاضی تھے۔ اور آخر عمر مین انہون نے حجاز کا
سفر کیا۔ اور مدینہ طیبہ حضرت رسول علیہ السلام مین جا کے انتقال کیا۔
علاوہ اُس سلسلہ تعلیم کے جو جامع بنی امیہ مین جاری تہا۔ اسی زمانے مین
دمشق بہت سے اور مدارس پر بہی ناز کر رہا تہا جنکے لئے علحدہ عمارتین بنی ہوئی
تھین۔ اور اطراف عالم سے لوگ آآ کے وہان تعلیم پاتے تھے سب سے زیادہ مدرسے
شافیہ کے تھے اور اُنہین سے سب سے بڑا مدرسہ عادلیہ تہا جس مین قاضی القضاۃ شافعیہ
انفصال مقدمات کرتے تھے۔ اور اسی مدرسے کے مقابل مین شافعیون کا دوسرا عظیم
الشان مدرسہ مدرسۂ ظاہریہ تہا جسمین ملک الظاہر کی قبر تہی اور اس مدرسے مین قاضی
القضاۃ شافعی کے نائب یا آجکل کی اصطلاح کیموافق اسسٹنٹ بیٹھ کے فیصلہ
کرتے تھے۔ اور نائبون مین دو شخص زیادہ سربرآوردہ تھے۔ فخر الدین حیطی اور جمال
الدین بن جملہ جو جلال الدین محمد قزوینی کے مصر جانے کے بعد دمشق مین قاضی القضاۃ
شافعی ہو گئے تھے۔ حنفیہ کے بہی بہت سے مدرسے تھے اور سب سے بڑا مدرسہ
سلطان نور الدین تہا جو قاضی القضاۃ حنفیہ کا دار القضا تہا۔ مالکیہ کے تین مدرسے
تھے ایک مدرسۂ صمصامیہ جسمین قاضی القضاۃ مالکی خدمت قضا کو بہی سرانجام دیتے تھے
اور رہتے بہی تھے۔ دوسرے مدرسہ نوریہ جسکو سلطان نور الدین محمود بن زنگی نے تعمیر کیا تھا
تیسرے مدرسہ شرابشیہ جسکو دمشق کے ایک تاجر شہاب الدین شرابشی نے تعمیر کرایا تہا حنابلہ

کے بہی مختلف مدرسے تھے جنمین سب سے زیادہ عالیشان اور مشہور مدرسہ نجمیہ تہا۔
اسکے بعد ابن بطوطہ بیان کرتاہے کہ شہر دمشق کے اُن دونون آٹھ پہاٹک تھے
جنمین سے چار پہاٹکون کے اُسنے نام بتلے ہین۔ باب الفرادیس۔ باب الجابیہ
باب الصغیر اورہ باب شرقی اور کہتاہے کہ باب جابیہ اور باب الصغیر کے درمیان مین
ایک گنج شہیدان ہے جہان بہت سے صحابہ اور اُنکے ساتہہ جام شہادت نوش
فرمانے والے پر جوش مسلمان شہادت کی زندگی رحمت الٰہی کے خواب نوشین مین
گذران رہے ہین۔ اور اسی مقام پر ام المومنین ام حبیبہ بنت ابی سفیان اور اُن کے
بہائی معاویہ رضی اللہ عنہا کی قبرین ہین اور موذن رسول اللہ حضرت بلال رضی اللہ
عنہ بہی یہین مدفون ہین اور اویس قرنی اور کعب احبار کی قبرین بہی اسی مقام پر
ہین دمشق کے مغرب جانب ایک اور مقام ہے جو قبور شہیدا کے نام سے یاد کیا
جاتاہے صحابہ کرام بلکہ خاص ان لوگون مین سے جنکی شان مین قرآن مین آیاہے والذین
بایعوا تحت الشجرۃ یہ ناموراس مبارک تختۂ زمین کے نیچے آرام فرما رہے ہین۔
ابو درداء اُنکی زوجہ ام الدرداء افضالہ بن جنید۔ واثلۃ بن اسقع سہیل بن حنظلہ
رضی اللہ عنہم اجمعین۔ دمشق سے مغرب جانب چار میل پر ایک گاؤن ہے جسے
منیحہ کہتے ہین۔ وہان سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی قبر شریف ہے۔ اور اُس قبر
کے متصل ایک چہوٹی سی خوبصورت مسجد بہی ہے۔ اور مسجد کی محراب پر یہ عبارت
لکہی ہے ''ہذا قبر سعد بن عبادہ راس الخزرج صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وتسلیما'' یہ قبر سعد بن عبادہ کی ہے جو قبیلہ خزرج کے سردار اور رسول اللہ صلعم کے
صحابی تھے۔ اور ایک اور گاؤن مین جو دمشق سے ایک فرسخ پر واقع ہے جناب امیر المومنین
علی بن ابی طالب کی صاحبزادی اور حضرت رسول خدا علیہ السلام کی نواسی ام کلثوم رض
کا روضۂ مقدس ہے۔ کہتے ہین کہ ان صاحبزادی کا اصلی نام زینب تہا لیکن شکل اور

صورت مین چونکہ رسول اللہ صلعم کی صاجزادی یعنی اپنی خالہ ام کلثوم رضہ کے بہت مشابہ تہین لہذا آنحضرت نے ان کی کنیت بہی ام کلثوم رکہدی - اس روضہ کے متعلق ایک عمدہ مسجد ہے اور بہت سی جائداد اور اراضی اس روضہ کے متعلق وقف ہین - اہل شام اس مقام کو قبرالست ام کلثوم کہتے ہین اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے قریب ہی جناب امام حسین علیہ السلام کی صاجزادی سکینہ رضی اللہ عنہا مدفون ہین اور دمشق کے مشرق جانب اُسکے مضافات مین سے ایک گاؤن ہے جو جامع نیرب کے نام سے مشہور ہے - اس گاؤن مین ایک قبر بنی ہے جسکی نسبت مشہور ہے کہ اسمین جناب مریم بتو علیہا السلام کی والدہ مدفون ہین - اور دارایا نام ایک گاؤن مین جو شہر سے مغرب جانب چار میل پر ہے ابومسلم خولانی اور ابوسلیمان دارانی کی قبرین ہین - دمشق کے جو متبرک مقامات مشہور ہین انمین مسجد اقدام کو سب سے زیادہ شہرت ہے - اور حقیقت مین اس مقام سے برکت کے نمونے ظاہر ہوتے ہین - دمشق سے حجاز یا بیت المقدس مصر کو جانے والے جس سڑک پہ جاتے ہین عین اُس سڑک پر دمشق سے دو میل جا کے مسجد اقدام ملتی ہے - یہ بہت بڑی مسجد ہے اور اُسکی عظمت کے مطابق اُسپر جائدادین بہی بہت وقف ہین - اس مسجد کا نام مسجد اقدام اس لئے رکہا گیا کہ وہان ایک پتھر ہی جسپر پیغمبر خدا جناب موسیٰ علیہ السلام کے نقش قدم بنے ہین - اس مسجد کی عمارتون مین ایک حجرہ ہے جس پہ یہ عبارت لکہی ہے دو ایک بزرگ نے اس حجرہ مین جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب مین دیکہا اور آنحضرت نے خواب ہی مین انکو بتایا کہ اس مقام پر میرے بہائی موسیٰ کی قبر ہے،، اِسی وجہ سے اس حجرہ کی زیارت کی جاتی ہے، دمشق کے باب شرقی کے قریب ایک سفید منارہ ہے جسکی نسبت لوگون کا اعتقاد ہے کہ قرب قیامت مین جناب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اُسی منارہ پر اُترینگے -

اس مقام پر ابن بطوطہ کہتا ہے کہ دمشق کے قرب وجوار کی آبادیان حُسن وخوبی اور دلفریبی مین خاص شہر دمشق سے زیادہ خوش سواد واقع ہوئی ہین - اس لیئے کہ خاص دمشق کی گلیان کثرت آبادی کی وجہ سے اکثر تنگ ہین اور باہر کے مقامات کہلے ہوے اور ہوادار ہیں - شہر سے شمال کی طرف جو مقام ربض الصالحیہ کے نام سے مشہور ہے اسکی نسبت کہتا ہے کہ وہ گاؤن کا ہے کو ایک بڑا شہر ہے جس کا بازار اپنی خوبی اور عمدگی مین دُور دور مشہور ہے اور حقیقت مین بیمثل ہے - اس مقام مین ایک مسجد جامع اور ایک شفاخانہ ہے - ایک مدرسہ بہی ہے جو مدرسہ ابن عمر کے نام سے شہرت رکہتا ہے - یہ مدرسہ خاص اُن لوگون کا ہے جو سن رسیدہ بلکہ بوڑہے ہون اور آخر عمر مین قرآن مجید پڑہنا چاہین - اُنکے لئے کھانے پینے اور تمام مصارف کا انتظام خود مدرسے کے سرمائے سے ہوتا ہے اور بوڑہے خدا دوست بے فکر ہوکے خدا کی کتاب پڑھ سکتے ہین - اس مقام کے کل رہنے والے مذہب حنبلی کے تابع ہین - ابن بطوطہ کہتا ہے کہ جس قسم کا اور جن اغراض کے لئے ربض الصالحیہ کا مدرسہ قائم ہے اُنھین اغراض کے لئے شہر دمشق مین بہی ایک مدرسہ ہے جو مدرسہ ابن منجا کے نام سے مشہور ہے -

اسمین کوئی شک نہین کہ دمشق بڑا ہی خوش نصیب شہر ہے - خدا نے تمام دنیاوی خوبیون کے علاوہ اُسے دینی برکتون اور انبیائے سلف کی مقدس یادگارون سے ایسا آراستہ کر دیا ہے کہ باستثنائے چند بلاد کوئی شہر اسکی ہمسری کا دعوے نہین کر سکتا - دمشق اور صالحیہ کے شمالی طرف ایک پہاڑ ہے جسے جبل قاسیون کہتے ہین انبیائے سلف مین سے اکثر اس پہاڑ پر چڑہے ہین جن کی برکت نے اُس پہاڑ کو آج زیارت گاہ خلائق بنا دیا ہے - اس شہر کے متصل وہ غار ہے جسمین خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے تھے - یہ ایک تنگ اور

طولانی غار ہے۔ غار کے اُوپر ایک عالیشان مسجد بنی ہے جسکا حجرہ نہایت ہی شائستگی
اور خوشنمائی کے ساتھہ بنایا گیا ہے۔ کہتے ہین کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
نے اِسی غار سے تارے ماہتاب اور آفتاب کو دیکہا تہا جیسا کہ قرآن مجید مین آیا
ہے غار کی پشت پردہ مقام ہے جہان حضرت ابراہیم غار سے نکلکر اکثر تشریف
لیجایا کرتے تھے۔ اس شہر کے مغرب جانب بھی ایک بہت پُرانی یادگار ہے جو
ایک پہاڑ سے عبارت ہے جسے مغارۃ الدم کہتے ہین۔ اس پہاڑ کی چوٹی پہ
ایک سرخی نمایان ہے جسکی نسبت لوگ کہتے ہین کہ وہ حضرت ہابیل ابن آدم علیہ السلام
کے خون کی سرخی ہے اور خدا نے محض اُنکی یادگار قائم رکہنے کے لیئے اس سُرخی
کو آجتک باقی رکہا۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ اس مقام پہ ابراہیم۔ موسیٰ عیسیٰ ایوب
اور لوط علیہم السلام ان پیغمبرون مین سے ہر ایک نے نماز پڑہی ہے۔

جبل قاسیون مین ایک گاؤن ہے جو قرآن مجید مین ذات قرار ومعین کے الفاظ
سے تعبیر کیا گیا ہے یہین جناب مسیح علیہ السلام کو لیکے مریم بتول نے پناہ لی تھی۔
اس گاؤن کی نسبت جو الفاظ ابن بطوطہ نے استعمال کئے ہین شاید اُنمین کسی قدر
مبالغہ ہو مگر جہان تک اصلیت تسلیم کیجائیگی وہ بہی اسکی خوبی کو بہت ترجیح کیساتھ
ثابت کردے گی کیونکہ وہ کہتا ہے "یہ گاؤن دنیا کے تمام مقامات سے زیادہ
خوشنما اور خوش سواد ہے۔ بڑی بڑی شاندار عمارتین اور رفیع البنیان محل قائم
ہین اور باغون کی آراستگی سے عجیب وغریب لُطف پیدا کیا گیا ہے" ابن بطوطہ
نے اس گاؤن کی تصویر دکہانے اور اسکی اُن سات نہرون کا حال بیان کرنے
مین بہت زور دیا ہے۔ کہتا ہے کہ جس خوبی سے یہ نہرین بنائی گئی ہین اور
جسطرح یہ کہین پر جُدا ہوجاتی اور کہین آپسمین ملجاتی ہین وہ خوبی اور صنعت دنیا
مین اور کہین کم نظر آئے گی۔ علاوہ جناب مریم کے مکان کے یہان ایک مکان ہے

جسمین بیان ہے کہ جناب خضر علیہ السلام نماز پڑھا کرتے تھے۔ لوگ اُس مکان مین نماز ادا کرنے کے لئے دُور دور سے آتے ہین۔ دمشق کے مشرق جانب ایک اور گاؤن بتا یاہے جسے بیت الاہیتہ کہتے ہین اُسمین ایک کنیسہ تہا جسمین آذر بت تراش بیٹھ کے اپنے بت بنایا کرتا تھا۔ اور جناب خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام نے اُن بتون کو توڑ ڈالا تہا۔ اُس کنیسہ کے مقام پر ایک عالیشان مسجد بنی ہے۔

اسکے بعد ابن بطوطہ دمشق کے اوقاف یعنی مختلف فنڈون کا حال بیان کرتا ہے جو پبلک کی کوششون سے قائم تھے۔ کہتا ہے کہ یہان مختلف اغراض کے لئے بہت سے فنڈ قائم ہین جنکے ذریعے سے ہر قسم کی فیاضی کے نمونے نظر آتے ہین۔ مثلاً ایک فنڈ اُن لوگون کے لئے قائم ہے جو اپنی ناداری کے باعث حج سے معذور ہین اس فنڈ سے اُن کو زاد راہ دیا جاتا ہے اور وہ باطمینان حج کر آتے ہین۔ ایک فنڈ اسلئے قائم ہے کہ غریب اور محتاج لڑکیون کا عقد کر دیا جائے۔ اور وہ اپنے لئے اپنا خبر گیران شوہر پا سکین۔ ایک فنڈ اس غرض کے لئے ہے کہ محتاج اور مفلس قیدیون کو خواہ مسلمان یا دوسری قوم کے لوگون کے ہاتھ سے زر فدیہ ادا کرکے رہائی دلائی جائے ایک فنڈ بطور منیوسپلٹی کے قائم ہے جسکے سرمایہ سے دمشق کی گلیان اور سڑکین خوبصورتی سے بنائی جاتین اور صاف رکھی جاتین۔ اور کہتا ہے کہ دمشق کی سڑکین نہایت خوش اسلوبی سے بنائی گئی ہین بیچ مین گاڑیون اور گھوڑون کے گذرنے کا راستہ ہے اور دونون طرف پٹریان بنی ہین جنپر پیادہ آدمی گذرتے ہین اسکے علاوہ بہت سے خیر کے کامون کے لئے الگ الگ فنڈ ہین جن سے ہمیشہ لوگون کی حاجتین پوری کیجاتی ہین اور غربا کو مصائب سے نجات دلائی جاتی ہے۔

اس موقع پر ابن بطوطہ ایک واقعہ لکھتا ہے جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ دمشق سے غربا کو ان فنڈون کے ذریعے سے کیسی مدد ملتی رہتی تہی کہتا ہے ایک

دن مین دمشق کی سڑک پر چلا جاتا تہا۔ اتفاقاً میرے برابر سے ایک کمسن غلام گذرا جسکے ہاتہہ مین چینی کی پلیٹ تہی خدا جانے کیا اتفاق ہوا کہ وہ پلیٹ اُس کے ہاتہہ سے چہٹ کے گر پڑی اور گرتے ہی ٹوٹ گئی۔ غلام اپنے مالک کے خوف سے رونے لگا اور کہنے لگا آہ اب کیا ہوگا۔ دیکہون اسکے معاوضے مین مجہپر کسقدر مار پڑتی ہے۔ میرا مالک تو مجہے مار ڈالے گا اُسکو روتے دیکہکر چارون طرف سے لوگون نے اُسے گہیر لیا اور اُسکی حالت دیکھنے لگے۔ بازاریون مین سے کسی کو اُسپر ترس آگیا۔ اور کہنے لگا تو گہبرا نہین۔ اس پلیٹ کے ٹکڑے اُٹھالے اور میرے ساتہہ اُن صاحب کے پاس چل جو اُس فنڈ کے سکرٹری ہین جس سے ظروف شکستہ کا معاوضہ کیا جاتا ہے۔ غلام نے پلیٹ کے ٹکڑے اُٹھالئے اور اُس شخص کے ساتھ سکرٹری فنڈ کے پاس گیا اور شکستہ پلیٹ دکھائی۔ سکرٹری نے فوراً ویسی ہی پلیٹ فنڈ کے سرمائے سے خرید کے اُس غلام کو دی اور وہ اپنے مالک کے پاس اطمینان سے گیا اور سرخرو ہوا۔

ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اُن دنون اہل دمشق عام طور پر ایسے فیاض تھے اور اُن مین اسقدر دینی جوش تہا کہ ہمیشہ تعمیر مساجد اور مدارس اور غربا کی خبر گیری مین مشغول رہتے تھے۔ اور شہر مین معاش کے ذریعے اسقدر کہلے ہوئے تھے کہ جس شہر اور جس مقام سے جو کوئی آجاتا تہا ممکن نہ تہا کہ اُسکی زندگی زیادہ امیدواری یا پریشانی مین گذرے۔ آتے ہی کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش کا ہوجاتا تہا خصوص جس کسیکو طالب علمی یا دینداری کا ذوق ہوتا تہا اسکی سب سے زیادہ فارغ البالی کے ساتہہ گذرتی تھی۔

ابن بطوطہ نے اسکے بعد اُن علمائے دمشق کا نام بتایا ہے جنکی شاگردی تمام اُسے زندگی بہر فخر حاصل رہا۔ یہ علما اسکے اُستاد ہین جن سے اُس نے مختلف کتب حدیث

اور دیگر فنون کی سند حاصل کی - ابن بطوطہ نے اپنے اساتذہ مین سے دس بارہ[۱۲] لوگون کے نام بتائے ہین اُمنن دو عورتین بہی ہین - اور اُنکی شہرت اور کمال علمی کا اسقدر شہرہ تہا کہ ابن بطوطہ نے فخر سمجہکے اُنکی شاگردی کی عزت حاصل کی ایک توام محمد عائشہ بنت محمد بن مسلم بن سلامۃ اعراقی ہین - اور ایک زینب بنت کمال الدین احمد بن عبد الرحمن بن عبد الواحد المقدسی ہین - بلکہ زینب کے علم وفضل کی شہرت اسقدر تہی کہ ابن بطوطہ اُس معصومہ عالمہ کو رحلۃ الدنیا کے لقب سے یاد کرتا ہے یعنی اُسکے علم وفضل سے بہرہ یاب ہونے کے لئے ساری دُنیا کے لوگ مصائب سفر اُٹھا اُٹھا کے اُس کی خدمت مین حاضر ہوتے تھے اور حلقہ درس مین شریک ہوتے تھے -

کہان ہین وہ لوگ جو تعلیم نسوان کے خلاف ہین - جو عورتون کی تعلیم کے نہ جائز ہونے کی دلیل مین اپنے بچپن کے اُس دور کو پیش کردیا کرتے ہین جب عورتین جاہل ہوتی تہین اور لکہنا تو بالکل نہین سکہایا جاتا تہا مگر خاص خاص سن رسیدہ عورتون یا گہر کے بوڑہے مردون کے ذریعہ سے فقط قرآن اور چند اُردو رسالے پڑہا دیئے جاتے تھے اگرچہ گستاخی ہے مگر مین عرض کرتا ہون کہ اگر قدامت ہی دلیل ہے تو اپنے بچپن کے دَور کو نہ یاد کیجئے بلکہ اُس بہت قدیم دور کو یاد کیجئے جس عہد کا بوڑہا اب باقی ہونا تو درکنار آپ نے کبھی اپنے بچپن مین بھی نہ دیکہا ہوگا جس عہد کا ذکر ابن بطوطہ کر رہا ہے اگر اُس سے پہلے عہد کو دیکھئے گا تو آپ کو تعلیم نسوان اُس سے بہی زیادہ ترقی پر منظر آئے گی - عباسیہ دور کے علمی اسٹیج دیکھئے جہان صرف ناموس ہیروہی نہ ملین گے بلکہ صدہا ہیروئن ہی ملینگی -

ابن بطوطہ کہتا ہے کہ مین نے اپنے ان اساتذہ دمشق سے ۲۶ھ مین سند حاصل کی

ہم نے ابن بطوطہ کے سفر نامے دمشق کے مختصر حالات لئے ہیں ورنہ اُس نے اور زیادہ تفصیل سے شہر دمشق کے مقامات اور حالات کا تذکرہ کیا ہے ۷۲۶ھ ہی میں رویت ہلال ہوتے ہی وہ بغرض حج عرب کی طرف روانہ ہوا۔ اور دیگر بلاد کی سیر میں مشغول ہوگیا۔ اور آخر جوار رسول علیہ الصلوۃ والسلام کی برکات سے بہرہ یاب ہوتا ہوا مکہ معظمہ پہنچکر شریک حج ہوا۔

زبیر ابن عوام

فتوحات عرب کے اکثر واقعات مکرر دسہ کرر بیان کئے گئے۔ اگرچہ وہ جزئی واقعات ہیں۔ اور اسلامی قدیم شجاعت کا دفتر اتنا مختصر نہین ہے کہ اس کو ہم یا ہمارے ہمعصر اخبار تمام وکمال بپا کر سکیں۔ واقدی کی فتوح الشام اکثر لوگ دیکھ چکے ہیں مگر اُس کتاب پر معتمد مورخوں کو پورا پورا اعتبار نہیں باہم لڑائی کی نوعیت اور فتوحات کا سلسلہ اچھے طور سے معلوم ہو جاتا ہے۔ لہذا اگر اُس کتاب سے مدد لے کے ہم بیان کرنے پر آئین تو ہم ملک کے سامنے کوئی نیا واقعہ نہین پیش کرینگے اور اکثروں کو سنی ہوئی بات ہونے کی وجہ سے مزہ بھی نہ آئیگا۔ اس مرتبہ ہم انگریزی کی سب سے زیادہ معتمد تاریخ گبن سے لے کے افریقہ کی فتوحات کا پہلا واقعہ اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ یہ واقعہ نیا ہے۔ اور دلچسپی سے بھی خالی نہین۔

خلیفہ ثانی جناب فاروق رض کے عہد میں پورا ملک مصر فتح ہو چکا تھا مگر افریقہ میں آگے بڑھنے کا قصد پہلے پہل جناب عثمان رض کے عہد میں کیا گیا۔ اسلام نے اپنی فتوحات کے پھریرے ایشیا اور یورپ میں بھی اڑائے۔ مگر جس تکمیل اور اولو العزمی کے ساتھ براعظم افریقہ پر فوج کشی کی گئی ہے۔ اور اسلامی افواج نے جس نہ جھجک طلی ہمتوں سے افریقہ کے ریگستانوں کو طے کیا ہے۔ وہ اسلام ہی نہین خاصتہً اہل عرب کا حصہ تھا۔

ان فتوحات کی انتہا تو اُس وقت کو خیال کیجئے جب عقبہ بن نافع نے اٹلینٹک اوشن (بحر اعظم مغرب) کے ساحل پر ناپیدا کنار سمندر کی موجین دیکھ کے اور جوش میں آ کے سمندر میں گھوڑا ڈال دیا تھا اور چلا کے آسمان کیطرف دیکھ کے یہ پُر جوش کلمہ زبان سے نکالا تھا "خدایا اگر یہ ناپیدا کنار سمندر میری راہ میں حائل نہ ہو جاتا تو میں یونہین تیرے مبارک نام کی منادی کرتا۔ اور نہ معلوم اقوام مغرب میں تیری توحید کو پھیلاتا برابر چلا جاتا" جسکے بعد مسلمانون کو داہنے ہاتھ کیطرف مڑ کے اور یورپ میں اُتر کے سرزمین اندلس فتح کرنا پڑی لیکن اس فوج کشی کی ابتدا یوں ہوئی کہ جناب ذوالنورین ؓ نے صحابہ کبار اور ناموران مہاجرین وانصار میں سے چنکے بیس ہزار فوج مرتب کی اور اُن لوگوں کو دعائے خیر سے یاد کر کے اور فتح کی بشارتین دے کے مدینہ منورہ سے افریقہ کیطرف روانہ کیا۔ اس فوج نے بڑے جوش وخروش سے مبارک سرزمین عرب اور مقدس جوار رسول کو چھوڑا۔ جب یہ لوگ لشکر گاہ ممفس میں پہنچے تو خاص مصری لوگونکی ایک اور فوج جس میں بھی بیس ہی ہزار آدمی تھے۔ اُن کے ساتھ شامل ہو گئی۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعید سپہ سالاری کے لئے منتخب ہوئے۔ عبداللہ بن سعید اُس عہد کے نامور لوگوں میں تھے۔ اگرچہ اُن کے ذمہ یہ بہت بڑا سخت الزام تھا کہ انھوں نے اپنی چالاکیوں اور فتنہ پردازیون سے قدیم فاتح اور نیز صوبہ دار مصر کو اُس کی حکومت سے اٹھا دیا تھا۔ مگر باوجود اس کے اُن کی ناموریوں اور سپہگریوں نے اس الزام کو ضعیف کر دیا۔ اور ایسی معزز خدمت پر مامور کر دیئے گئے۔ عبداللہ بن سعید نے اپنے زور قلم اور اپنی اعلیٰ کتابت کی وجہ سے جناب رسالتمآب صلعم کے زمانے میں کتابت قرآن مجید کی عزت حاصل کر لی تھی ان کے خاندانی تعلقات اور نیز اُن کی زندگی کے واقعات نے انھین قریش میں نہایت زیادہ سر برآوردہ مشہور کر دیا تھا اور ایک ایسی قوم میں جسکا عام جوہر سپہگری تھا۔

اُس میں اُنہوں نے اپنی شجاعت اور شہسواری کو ممتاز بنالیا تھا۔ الغرض عبداللہ بن سعید کا ایسا نامور اور بہادر شخص چالیس ہزار مسلمانوں کی فوج لیکے سرزمین مصر سے روانہ ہوا۔ مصر کی حدود سے نکل کے یہ لوگ اُن مغربی سرزمینوں اور مقامات میں برابر گھستے چلے گئے جو اُس سے پیشتر نامعلوم اور مہذب دنیا کی نگاہ سے چھپے ہوئے تھے۔ اگر اہل روم ہوتے تو ارض برقا کی تپتی ہوئی زمین اور جھلسا دینے والی بھوبل سخت مہلک اثر نمایاں کرتی۔ مگر ان عرب جنگ آزماؤں کا کچھ نہ بگاڑ سکی جو اپنے وفادار اونٹوں پر سوار تھے اور برابر ترقی کرتے چلے جاتے تھے۔ خصوصاً اہل عرب کے ہمراہ افریقہ ہی کی فوج تھی اُن لوگوں کو کچھ معلوم بھی نہ ہوا بے خوف خطر آگے ہی قدم بڑھاتے رہے۔

ایک سخت اور جانکاسفر کے بعد ان لوگوں نے طرابلس کی دیواروں کے نیچے خیمے ڈالے۔ طرابلس ایک بندرگاہ ہے۔ اور ساحل بحیرہ روم پر آباد ہے اُن دنوں بوجہ کثرت آبادی۔ دولتمندی۔ شہرت وغیرہ۔ یہ تمام ارض برقا کا مرجع بن گیا تھا اور اب بربر کے تمام شہروں کے مقابل میں تیسرے درجہ پر واقع ہے اہل عرب نے جیسے طرابلس کا محاصرہ کیا یونانیوں کی ایک فوج نے شہر سے نکل کے مقابلہ کیا عربوں نے پہلے ہی حملہ میں سب کو دریا کے کنارے کاٹ کے ڈال دیا مگر محاصرہ میں اُس وقت سستی ہوگئی جب کہ گریگوری افریقہ کے ایک مشہور بادشاہ نے آکے عربوں کے سامنے اپنی صفیں قائم کیں۔ چند روز تک برابر یہ عالم رہا کہ تڑکے نماز کے وقت سے ٹھیک دوپہر تک دونوں طرف کی فوجیں نہایت سختی سے بازار جنگ گرم کرتی تھیں۔ اور گویا اُس وقت تک آرام و راحت کو بھول جاتی تھیں جب کہ آفتاب گرمی پکڑے اور سپاہیوں کو تھکا کے مجبور کر دیے۔ کہ کسی سایہ کے مقام میں جاکے اُس کی کرنوں سے پناہ لیں۔

شاہ گریگوری کی بیٹی جو اپنے حسن و جمال اور نیز شجاعت کے لحاظ سے افریقہ میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی اور ہنوز ناکتخدا تھی مورخین کا بیان ہے کہ وہ لڑکی اپنے باپ کے پہلو بہ پہلو میدان جنگ میں آ کے مقابلہ کرتی تھی۔ اُس کو بچپن ہی سے شہسواری تیر اندازی اور تیغ زنی کی تعلیم دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اعلیٰ قسم کے اسلحہ اور اُس کی دولتمندانہ وضع نے لڑائی کی صفوں میں اُسے اور بھی ممتاز بنا دیا تھا۔ یہ اشتہار دے دیا گیا کہ جو شخص عربوں کے سردار کا سر کاٹ لائیگا اُس کو ایک ہزار اشرفیاں نقد دی جائینگی اور اس لڑکی کے شوہر ہونے کی عزت پائیگا۔ اس سب سے زیادہ دلفریب انعام کی اسپنے۔ افریقہ کے تمام نوجوانوں کے دلوں میں جوش پیدا کر دیا اس جوش کا یہاں تک اثر ہوا کہ تمام مسلمانوں نے مجبور کرنے سے عبداللہ بن سعید سپہ سالار افواج عرب نے میدان جنگ میں آنا چھوڑ دیا اور آخر کار سپہ سالار کے عزلت گزین ہو جانے سے مسلمانوں کی ہمت اور اولوالعزمی میں بھی فرق آگیا۔

وہ شریف اور ممتاز فخر عرب جو بعد ایک زمانہ کے حضرت علی کا رقیب ہو گیا تھا اور جو ایک آئندہ خلیفہ کا باپ تھا اور جس نے فتوحات مصر میں اپنے تئیں باعتبار شجاعت کے بے مثل اور یکتا ثابت کر دیا تھا اور وہ نامور جس نے سب کے پہلے بابل کی دیواروں کے سامنے اسلامی جھنڈا گاڑ دیا تھا وہ کون۔ زبیر بن عوام۔ ان افریقہ کی لڑائیوں میں زبیر بن عوام عبداللہ بن سعید کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ جب طرابلس سے ایسی وحشتناک خبریں آئیں تو زبیر نے بارہ آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا اور فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس دلیری اور تعجیل کے ساتھ یونانی لشکر گاہ کا راستہ لیا کہ جب تک وہاں پہنچ نہ گئے خواب و خور اپنے اوپر حرام کر لیا۔ زبیر نے کھانا اور نیند صرف اسواسطے چھوڑ دی تھی کہ اپنے اسلامی بھائیوں کے ساتھ ایسی ہمدردی تھی کہ جب تک وہاں پہنچ نہ لئے کسی طرح چین نہ آیا۔ میدان جنگ میں پہنچکے زبیر نے چاروں طرف

دیکھا اور چلا کے پوچھا "ہمارے سردار کہاں ہیں؟ کسی نے کہا "خیمے میں" اس پر زبیر آشفتہ ہو کر بولے "کیا مسلمانوں سپہ سالاروں کا کام خیمے میں بیٹھنا ہے" یہ آواز خود عبداللہ کے کان میں پہنچی سنتے ہی اُن کا چہرہ زرد ہو گیا۔ زبیر کے سامنے آئے اور گریگوری اور اس کی بیٹی کا تمام واقعہ بیان کیا زبیر نے کہا "کفار کے اس فریب کو انہیں پر کیوں نہ الٹ دو۔ مسلمانوں کو پکار کر کہہ دو کہ جو کوئی شخص گریگوری کا سر کاٹ لائیگا اُسے انعام میں اس کی بیٹی اور ایک لاکھ اشرفیاں دیجائینگی" زبیر بن عوام کی اس تدبیر نے سپہ سالار عبداللہ کو ایسا اطمینان دلا دیا کہ خود اُن کا بھی ذہن کھل گیا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک اور بھی ہوشیاری کا کام کیا۔ وہ یہ کہ جتنے لوگ میدان میں مقابلہ پر تھے وہ مقابلہ ہی پر رہے باقی جو خیموں میں تھے ان کو حکم دیا کہ ابھی یونہیں مخفی بیٹھے رہیں جب میدان کی فوج دیر تک مقابلہ کر چکے اور دشمنوں کو تھکا دے تو یک بیک تکبیر کا شور کرتے ہوئے نکل پڑیں۔

فوج کو اس انتظام سے مطلع کر کے عبداللہ اور زبیر میدان میں نکلے۔ اور لڑائی شروع ہوئی۔ بازار مرگ گرم ہو گیا۔ عرب سپاہی جو جو اپنی شجاعت کو ترقی دیتے وہ وہ افریقہ والوں میں بھی سرگرمی اور ثابت قدمی بڑھتی جاتی تھی۔ آخر یہ ہوا کہ دونوں طرف کی فوجیں تھک گئیں اور آخر آفتاب نے بالکل اس قابل نہ رکھا کہ حریف کا مقابلہ کر سکیں۔ دونوں لشکر اپنے اپنے فرودگاہ کی طرف واپس گئے۔ اور حدت گرما نے اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ جاتے ہی ہتیار کیا معنی کپڑے تک اتار کے پھینک دیئے اور گھوڑوں کو بھی کھول دیا کہ دم بھر آرام لے لیں۔ خصوصاً گریگوری کی فوج والوں نے۔ اس لئے کہ اُن کے خیال میں اب لڑائی کا گمان بھی نہ تھا۔ اور شام قریب آگئی تھی جو بالکل راحت اور خواب کے لئے تھی۔

ناگہان تکبیر کی آواز آئی اور عربی خیموں سے یک بیک تازہ دم اور جانباز جوانون کا ایک نیا لشکر اگل دیا۔ اہل افریقیہ اور یونانی لوگ ان تازہ دم اور پُر جوش مسلمانون کی صورت دیکھتے ہی حیرت میں آگئے اور اس قدر مضطرب اور بدحواس ہوگئے کہ انہیں کچھہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اُس وقت خیال انہیں دکھا رہا تہا کہ گویا مسلمانون کی مدد میں آسمان سے فرشتوں کی فوج اُتر پڑی اور اہل اسلام کے دشمنون کو ڈھونڈھنے لگی۔ کہ جہاں ملیں ان کو کاٹ کے ڈالدے۔ الغرض گریگوری کے ہمراہی حیرت و اضطراب ہی میں رہے اور مسلمانوں کی جدید فوج نے بڑھ کے اُنپر ہر طرف سے وار کرنا شروع کردیئے۔ جو عیسائی جس مقام پہ تہا اس طرح قتل کیا گیا کہ مقابلہ کرنا یا اپنی حفاظت کی جرات بھی نہ ہوئی اور عالم حیرت ہی میں سے عالم فنا میں پہنچا دیا گیا۔

اہل عرب نے تھوڑے ہی عرصے میں ہزارہا یونانیوں اور اہل طرابلس کو تہ تیغ کیا۔ خود گریگوری کی قسمت میں تہا کہ زبیر بن عوام ہی کے ہاتھ سے جام مرگ نوش کرے۔ چنانچہ اثنار جنگ میں دونوں جوانمردوں کا سامنا ہو مگر گریگوری اس کو کیا کرتا کہ تقدیر نے زبیر کے حوصلے بڑھا دیئے تھے اور اسکا دل ابتدا ہی سے پژمردہ ہوگیا تہا۔ زبیر کے ایک بھرپور ہاتھ نے اسکا فیصلہ کردیا۔ اُس کی پریجہاں بیٹی نے اپنی حفاظت کے لئے بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا تہا اور جب تک لڑائی کا تہوڑا اثر بھی میدان جنگ میں باقی تہا۔ اُسکی تلوار بہادروں کے آگے چمکتی نظر آتی تہی آخر ہر چہار طرف سے اُسے عربون نے گہیر لیا۔ اور وہی سامنے آیا جو اُسکی قسمت میں تہا۔ یعنی گرفتار ہوئی اور لونڈیوں کے طور پر اسلامی خیموں میں باندھ کے بٹھا دیگئی اہل طرابلس اور یونانیوں کے باقی ماندہ لوگوں کو جب کہیں پناہ نہ ملی تو انہون نے میدان جنگ دشمنوں کے سپرد کیا۔ اور خود شہر سفیتولہ کا راستہ لیا تا کہ عرب کے نیزوں سے بچکے اُس شہر کی دیواروں کی آڑ میں پناہ لیں۔ سفیتولا کارتہیج سے جنوب جانب

ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر تھا۔

اس لڑائی کا نتیجہ تو یہ ہوا مگر ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ اُس کم نصیب پر جمال دوشیزہ یعنی گریگوری کی بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ وعدہ اور آئین نے مجبور کر دیا کہ مع ایک لاکھ اشرفیوں کے وہ اپنے باپ کے قاتل کی نذر کیجائے جب قیدی اور یہ تمام سامان مدینہ منورہ میں پہنچا تو حسب فرمان جناب عثمانؓ کل اراکین اسلام اور قدمائے مہاجرین اور انصار مسجد نبوی میں جمع ہوتے اور اس بھرے مجمع میں زبیر بن عوام کی جرات سپہگری حکمت عملی اور جوش و خروش کے متعلق ایک وسیع اور پرجوش خطبہ پڑھا گیا۔ اور گویا زبان حال سے ان کی حمایت اسلام و جانبازیوں کا شکریہ ادا کیا گیا اور اسی مجمع میں وہ انعام یعنی ایک لاکھ دینار اور حورش شاہزادی جو جرات۔ شجاعت۔ حسن و جمال اور علم و فضل میں اپنا نظیر نہ رکھی تھی۔ اُن کی نذر کی گئی۔

اس فتح کے ذریعے سے ہم نے اہل عرب کی کسی بہت بڑی یا مشہور سرکاراتی کا نمونہ نہیں دکھایا کیونکہ ان کی ترقی کی تاریخ میں جو واقعات نظر آتے ہیں ان کے مقابل میں یہ واقعہ کوئی چیز نہیں ہے ایسے ایسے صدہا معرکے ہیں جو قادسیہ مدائن۔ یرموک۔ اجنادین۔ دمشق۔ اور میدان نہاوند کی لڑائیوں کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ ہماری غرض یہاں صرف زبیر بن عوام کا کیرکٹر اور جوش دکھانا تھا کہ انھوں نے اپنے برادران اسلام کو ایک مصیبت میں مبتلا سنکے کس جوش مردانگی سے کام لیا۔ کس اضطراب و بیتابی کے ساتھ روانہ ہوئے اور کس اولوالعزمی سے وہاں طرابلس کی دیواروں کے نیچے نیزہ گاڑ کے مسلمانوں کے سردار عبداللہ بن سعید کا پتہ پوچھا۔ جو اضطراب زبیر کے دل میں پیدا ہو گیا اور جس جوش ہمدردی سے انھوں نے کام لیا اسی کے دکھانے کے لئے ہم نے

اس واقعہ کو نقل کیا تا کہ ہمارے معاصر اہل اسلام ہمدردی قوم کا اصول قدما سے سیکھیں اور جوش ہمدردی کا سبق اپنے بزرگوں سے لیں۔

عبداللہ بن زبیر

خلیفہ اوّل جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بڑی صاحبزادی اسمار رضی اللہ عنہا کا ذکر کرینگے جو صحابیہ بھی تھیں۔ اسمار کو لوگ ذات النطاقین کہا کرتے تھے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے۔ کہ نطاق عربی میں کمر بند کو کہتے ہیں۔ عرب میں عورتیں اپنی ساڑی یا تہمت پر ایک چوڑی سی پٹی کس کے باندھ لیا کرتی تھیں۔ آنحضرت صلعم نے جس وقت مکۂ معظمہ سے ہجرت کی ہے۔ ابوبکر صدیق کے گھر میں آئے اور سامان روانگی درست کرنے لگے۔ گٹھری وغیرہ باندھنے کے لئے کوئی چیز نہ تھی اسمار نے اپنا نطاق کھول کے دے دیا۔ جس کو طولاً چیر کے دو پٹیاں کر لی گئیں۔ ایک سے توشکیزے کا دہانہ باندھا گیا اور دوسرے سے وہ پوٹلی باندھی گئی جس میں کھانا تھا۔ آنحضرت نے اسمار کی ہمدردی سے خوش ہو کے فرمایا کہ اللہ جلشانہٗ ایک کمر بند کے عوض میں تمہیں دو کمر بند مرحمت فرمائے گا۔ اسلامی پبلک حضرت رسالت پناہ کے ہر جملے کو فوراً فخر کے ساتھ قبول کر لیا کرتی تھی۔ بس اسی وقت سے اسمار کا نام پڑ گیا ذات النطاقین +

جناب اسمار کی والدہ کا نام قیلہ تھا۔ جو عبدالعزی کی صاحبزادی تھیں۔ جناب ذات النطاقین کو سن تمیز پر پہنچنے کے بعد یہ فخر حاصل ہوا کہ زبیر ابن عوام کے ایسے جلیل القدر صحابی کی زوجہ ہوئیں۔ حضرت زبیر عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ عبداللہ بن زبیر جو اسلام کے مشہور نامور ہیں اور ایک عرصہ تک مکۂ معظمہ میں خلافت کرتے رہے وہ انہیں معصومہ کے بطن مطہر سے پیدا ہوئے تھے۔ بلکہ

اُن کی پیدائش بھی اسلام کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ غریب و بیکس مسلمانون کا خانمان خراب قافلہ جب آنحضرت کے شوق لقا میں مکہ چھوڑ کے مدینہ پہنچا تو یہود کو جو پہلے مدینے میں صاحب اثر تھے آنحضرت کے ساتھ عداوت پیدا ہوئی۔ اُسی عداوت کا ایک یہ بھی کرشمہ تھا کہ مشہور کر دیا وہم سے مسلمانون پر جادو کر دیا ہے اب کسی مسلمان کے لڑکا نہ ہو گا۔ خدا کی قدرت پہلے سال ہجرت مین جو پہلا لڑکا اسلام مین پیدا ہوا وہ عبداللہ بن زبیر تھے۔ ان کی ولادت سے آنحضرت اور کل جان نثاران جناب رسالت پناہ بہت خوش ہوئے۔ بلکہ مسلمانون نے جوش مسرت میں زور سے نعرہ تکبیر بلند کیا۔

خلافت راشدہ کے بعد معاویہ خلیفہ ہوئے۔ اور جب معاویہ کا دور بھی زمانے نے الٹا تو یزید کا ایسا ظالم شخص بادشاہ ہوا۔ یزید کے مظالم مسلمانون کا ہر بچہ جانتا ہے۔ یزید کے بعد عبدالملک بن مروان نے تاج سلطنت اپنے سر پر رکھا اور اُس کے مظالم حد سے گذرنے لگے۔ تو اہل مکہ نے مجبور ہو کر مخالفت کی اور عبداللہ بن زبیر جو پیشتر سے والی مکہ تھے۔ ان کو خلیفہ برحق قرار دیا۔ انہون نے نو برس تک اطراف عرب میں حکومت کی۔ اور آخر دمشق سے اُن کے مقابلہ کے لئے وہ ظالم شخص بھیجا گیا جسکا نام ظالمون کی فہرست میں سب سے زیادہ ابھرا اور خون کے حرفون میں لکھا ہوا ہمیشہ نظر آئے گا۔ یعنی حجاج بن یوسف۔ حجاج نے مکہ معظمہ کا محاصرہ کر لیا۔ کوہ ابوقبیس اور دیگر بلندیوں پہ منجنیق لگا دیئے گئے اور خاص خانۂ خدا پر جی کھول کے نشانہ بازی کی گئی۔ عبداللہ بن زبیر کے گرد اُن کے اعزہ و اقارب اور نیز اہل فوج میں سے کُل بارہ ہزار سپاہی تھے۔ اُن لوگون نے پہلے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا۔ جب محاصرے کو سات مہینے گذر گئے۔ اور لوگ بھوکوں مرنے لگے تو سب نے مجبور ہو کے حجاج سے پناہ مانگی اور ابن زبیر کو چھوڑ کے چلے گئے۔ آہ!

اُن کی بیکسی اس درجہ کو پہنچگئی۔ کہ خود اُن کے دو نورنظر اور جگر گوشہ حمزہ اور حبیب اُن کا ساتھ چھوڑ کے چلے گئے۔ عبداللہ بن زبیر ایسے نازک وقت میں کہ جب موت اور بدقسمتی انہیں آنکھوں نظر آئی نہایت حیران ہوئے اور کون تھا جس سے کچھہ مشورہ کرتے۔ جناب اسمار ذات النطاقین ابھی زندہ تھیں۔ ابن زبیر اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "اماجان۔ یاروں نے میرا ساتھہ چھوڑ دیا۔ اور بے وفائی کی۔ اُس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کہ خاص بیٹوں میں سے بھی دو اس سخت امتحان کے موقع پر ثابت قدم نہ رہ سکے۔ یہ چند لوگ باقی ہیں یہ بھی کب تک ۔ چند ساعت میں ساتھہ چھوڑ کے چلے جائینگے۔ اگر میں اطاعت قبول کرلوں تو یقین ہے۔ کہ حجاج اور اُس کے صلاح کار میری درخواست کو رد نہ کرینگے آپ اس بارہ میں کیا فرماتی ہیں؟"

یہ سن کے اسمار نے کہا "بیٹا۔ اپنے واجبات اور اپنے فرائض کو تمہیں خوب سمجھہ سکتے ہو۔ اگر تمہارے دل میں کوئی تردد نہیں ہے۔ اور تم کو یقین ہے کہ تم حق پر ہو اور لوگوں کو حق کی جانب بلاتے ہو تو حجاج سے مقابلہ کرو خدا کی مقرر کی ہوئی تقدیر پر شاکر رہو۔ اور یقین جانو کہ خدا تمہیں اور تمہارے دوستوں کو شہادت کے بعد بہت کچھہ جزائے خیر عطا کریگا۔ واقعی اس صورت میں تم بنی اُمیہ کو نہ دباو اور نہ اُن کی اطاعت کرو۔ اور اگر تمہاری غرض اس حکومت سے دنیا طلبی ہے تو تم خدا کے بہت بُرے بندے ہو۔ اس لئے کہ صرف اپنے نفس کی خواہش پوری کرنے کے لئے تم نے ہزاروں بندگان خدا کا خون گرایا۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ ہوں تو میں حق پر مگر اب بوجہ اس ضعف کے سوا اطاعت جھکانے کے کسی طرح مفر نہیں تو سنو یہ جوانمردوں کا کام نہیں ہے۔ کب تک زندہ رہوگے۔ ایک دن مرنا ہی ہے لہذا یہی مناسب ہے۔ کہ آج ہی ناموری اور عزت کے ساتھہ سفر آخرت کرو۔

اور دنیا کے فریبوں میں آ کے ڈر نہ جاؤ"

ابن زبیر نے کہا "اماجان - میں ڈرتا ہوں کہ اہل شام مجھے طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کرینگے اور میری لاش کو سولی پر چڑھائینگے - اس کے جواب میں جناب ذات النطاقین نے نہایت صبر و تحمل سے کام لیکر کہا "بیٹا جب بکری کو ذبح کر چکے اس کے بعد اگر اس کی کھال بھی کھینچ لیں تو اُسے صدمہ نہیں پہنچتا ہے - خدا سے مدد اور اعانت کی دعا کرو اور اپنے ارادے میں ثابت قدم رہو" یہ سنکے عبد اللہ بن زبیر نے کہا "والدہ میری بھی یہی نیت ہے اور الحمد للہ کہ میں ہمیشہ اپنے ارادے پر قائم رہا - ابتدائے عمر سے آجتک میں نے کبھی اس زندگی ناپائیدار کے فریبوں میں آ کے دنیا پسندی نہیں اختیار کی میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے بنی امیہ کی اگر مخالفت کی ہے تو صرف اس غرض سے کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ لوگ اپنے جور و تشدد سے خدا کی حرام کی ہوئی باتون کو حلال اور حلال چیزون کو حرام کردین - یہ اس خوف سے کہ کہین ایسا نہ ہو وہ لوگ خدا کی محبت کو خود بھی چھوڑ دیں اور دنیا سے بھی چھڑا دین - آپ نے میرے ارادے کو اور مضبوط کر دیا اور میری تائید کی - آج میں ظالموں کے ہاتھ سے مارا جاؤنگا - آہ ! کہیں ایسا نہ ہو کہ آپکے دل کو میرے مرنے سے صدمہ پہنچے - اماجان آپ اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیجئے اور یقین جانیئے کہ آپ کا بیٹا کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا - بدکاری اور برائی کی راہ نہیں چلا - احکام الٰہی کے جاری کرنے میں اور انصاف پسندی کے حقوق ثابت کرنے میں اس نے کبھی کوتاہی نہ کی - آج تک جس کسی سے عہد کیا اس سے بیوفائی نہیں کی - دیدہ و دانستہ کبھی کسی مسلمان یا معاہدی پر کسی قسم کا ظلم نہیں جائز رکھا - اپنے عمال کو کبھی ظلم و ستم کی اجازت نہیں دی اور ہمیشہ میرے نزدیک کوئی چیز خدا کی مرضی سے زیادہ پسند نہ تھی - خداوندا اسوقت جو کچھ میری

زبان سے نکلا۔ اپنے نفس کو بڑھانے اور غرور کے لئے یا اپنی تعریف کے طور پر تھا بلکہ اس سے صرف اس قدر مقصود تھا کہ میں ان الفاظ سے اپنی مادر مشفقہ کے دل کو تسلی دے سکوں،، یہ سن کے اسماء بولیں وو بیٹیا انشاء اللہ تیرے معاملے میں صبر سے کام لونگی۔ اگر میرے سامنے تم مغلوب ہو کے دشمنوں کے ہاتھ سے مارے گئے تو میں صبر کرونگی۔ اگر خدا مجھے اس صبر کا اجر دیگا۔ اور اگر تم کو خدا نے کامیاب کیا تو تمہیں دیکھ کے میں اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرونگی۔ بس اب قدم بڑھاؤ اور خدا کی راہ میں دل کو مضبوط کر کے نکلو،، ابن زبیر نے پھر کہا وو اماں جان۔ اب میں جاتا ہوں۔ اس وقت مجھے آپ بے دعا کے نہ بھیجئے۔ میرے حق میں دعا فرمایئے اسماء بولیں میں ہر وقت تمہارے لئے خداوند کریم کی درگاہ میں دعا کرتی رہونگی اگر کسی اور نے دنیا طلبی اور حکومت کے شوق میں لڑائی کی تو تم نے ٹھیک ٹھیک صرف خدا تعالیٰ کی خوشی پوری کرنے کے لئے اسلحۂ جنگ ہاتھ میں لئے ہیں،، یہ کہکے اسماء نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اور یہ کلمات اپنی زبان سے نکالے خداوندا عبد اللہ کے دن کے روزوں اور اس کی رات کی عبادتوں کے عوض میں اور نیز ان تمام عبادتوں کے عوض میں جو مجھ سے اور اس کے باپ سے ظہور میں آئیں اپنی رحمت کو تو اس کے شامل حال کر دے۔ اپنے اس فرزند کو میں تیرے سپرد کرتی ہوں۔ اور تو نے جو کچھ اس کی قسمت میں لکھا ہے اس پر میں راضی ہوں بار الہا اس حال میں مجھے شکر کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کا ثواب مرحمت کر،، ابن زبیر نے یہ کلمات سنتے ہی اپنی ماں کے ہاتھوں پر بوسہ دیا۔ اسماء فرمانے لگیں: لو کیا بیٹیا اب تم مجھ سے رخصت ہوتے ہو؟ عبد اللہ نے کہا وو جی ہاں میں رخصت ہونے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں اس لئے کہ آج مجھے سفر آخرت کرنیکا کامل یقین ہے،، اسماء نے فرمایا۔ دیکھو ہوشیاری سے میدان میں نکلنا۔ مگر آؤ بیٹیا میں بھی تو

تمہین رخصت کردون" یہ کہکے فرزند کو گلے سے لگایا۔ اتفاقاً ذات النطاقین کا ہاتھہ زرہ پر پڑا جسکو عبداللہ بن زبیر پہنے ہوئے تھے فرمانے لگین "عبداللہ جن لوگون کو شہادت کی آرزو ہو ان کو جوشن و خفتان سے کیا کام" ابن زبیر کہنے لگے "اماجان مین نے صرف آپ کے دل کو تسلی دینے کے لئے یہ زرہ گلے میں ڈال لی تھی۔ ورنہ حقیقت میں مین نے زندگی کی طمع میں اسے نہین پہنا۔ اسماء بولیں "عبداللہ مجھے خدا پر بھروسا ہے۔ اس زرہ سے کیا ہو سکتا ہے" عبداللہ نے یہ سنکے زرہ اُتار ڈالی اس کے بعد آستینین چڑہائیں۔ دامن چڑہا کے کمر میں باندہ لئے اور میدان جنگ میں قدم رکہا۔ واہ! شوق شہادت اسے کہتے ہیں کہ جو رجزان بزرگوار کی زبان پر جاری تہا اُسکا بھی یہی مطلب تہا کہ "جب مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہو جاتا ہے اُسوقت مردانگی کے ساتھہ صبر کرتا ہون" بلکہ اُن کے یہ کلمات رجز سُن کے اسماء نے فرمایا "انشاء اللہ تو صابر اور ثابت قدم رہے گا۔ کیون نہ ہو۔ زبیر تیرے باپ۔ ابوبکر صدیق تیرے نانا اور صفیہ (آنحضرت صلعم کی پھوپی) تیری دادی تہیں"

الغرض ابن زبیر نے شیروں کی طرح حملہ کیا۔ اور پہلے ہی حملے میں لشکر حجاج میں زلزلہ ڈال دیا۔ کچھہ دیر مقابلہ کر کے واپس آئے۔ اور بیت اللہ شریف میں جا کے خاص مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز پڑہی اور پھر میدان جنگ میں کود پڑے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ ابن زبیر جس وقت شہید ہو کے گھوڑے پر سے گرے اُس وقت تمام اہل شام نے زور سے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ عبداللہ ابن عمر نے یہ سنکے فرمایا "واہ! کیا خدا کی قدرت ہے۔ ایک وہ دن تھا کہ ابن زبیر پیدا ہوئے تھے اور تمام مہاجرین و انصار اور تمام جان نثاران رسول مختار نے تکبیر کہی تہی اور ایک دن یہ تھا کہ ابن زبیر جس وقت بیجان ہو کے گرے اُس وقت ہمراہیان حجاج نے صدائے اللہ اکبر بلند کی"

ابن زبیر جس روز شہید ہوئے ہیں اُس روز جمادی الآخر کی ستر ہویں۔ اور سہ شنبہ کا روز تہا۔ اور ہجرت کا تہتروان سال تہا۔ عبد اللہ کی عمر بہی تہتہ ہی برس کی تقی۔ حجاج نے عبد اللہ بن زبیر کا سر مبارک شام میں بہیجا اور اُن کے جسم کو مکہ معظمہ کے قبرستان میں مصلوب کر کے لٹکا دیا۔ اسمار رضی اللہ عنہا نے ابن زبیر کی لاش مانگی کہ دفن کر دیں مگر جب تک دمشق سے منظوری نہ آلی اجازت نہیں ملی۔ اس واقعہ کے بعد حجاج نے اسمار کو بلا بھیجا مگر اسمار نے انکار کیا۔ حجاج نے دوسرا آدمی بہیجا۔ پہر اسمار کیطرف سے انکار ہوا۔ آخر خود حجاج آیا اور جناب ذات النطاقین سے کہنے لگا: میں نے عبد اللہ بن زبیر کے ساتھہ جو سلوک کیا اُس میں تم نے مجھے کیسا پایا؟ جناب ذات النطاقین نے جواب دیا۔ بس ایسا پایا کہ تو نے میرے بیٹے کی دنیا خراب کی اور اپنی عقبیٰ خراب کی جناب رسالتماب صلعم نے فرمایا ہے۔ ان فی ثقیف لذابا ومبیر العنی قبیلہ بنو ثقیف میں ایک جہوٹا اور ایک ہلاک کرنیوالا ہوگا۔ اور بیشک وہ ہلاک کرنے والا تو ہی ہے" جناب ذات النطاقین نے اگرچہ اس امر میں بہت بڑے صبر و استقلال سے کام لیا مگر دل کو جو صدمہ پہنچا تہا اُسکا کیا علاج تہا۔ ابن زبیر کی شہادت کے چند ہی روز بعد انہوں نے بہی سفر آخرت کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دیکھو جناب اسمار ذات النطاقین کی زبان فیض ترجمان سے جو کلمات نکلے ہیں اور جس صلاحیت اور بلند خیالی کو انہوں نے ظاہر کیا۔ اُس سے صاف ثابت ہوتا ہے۔ کہ اسمار کی سی عورتین اگر ڈھونڈی جائین تو دنیا میں بہت کم ملینگی یہ کہدینا بھی ٹھیک نہیں کہ عرب کی عورتین فطرۃً بہادر اور جری ہوتی تہیں اس لئے کہ عورت ہزار جری ہوگی اُس کی زبان سے ایسے متانت اور شائستگی ظاہر کرنے والے کلمات ہرگز نہ نکلین گے جب تک کہ وہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ نہ ہو۔ حالانکہ اسمار اُس عہد کی عورتوں میں ہیں جس عہد کے مرد بھی قوم اُمی خیال کئے جاتے تہے

اور اکثر ناخواندہ تھے۔ وہ عہد جو اسلام کا عہد وسطیٰ ہے یعنی بنو عباس کے دور میں بیشک عورتین اس اس کمال کی گذری ہیں۔ کہ جس فن فطرت انہون نے توجہ کی اُس کو تکمیل کو پہنچا دیا۔ اگرچہ حسب وصول اسلامیہ انہون نے اسلامی علوم ہی میں شہرت پائی مگر اس کو ہم بیان کر چکے ہین کہ اسلامی علوم ضمن میں ان کو منطق و فلسفہ کی پوری لیاقت حاصل ہو جاتی تھی۔ اگر ہم سے پوچھا گیا۔ تو ہم تفصیلاً بھی بیان کرینگے کہ عورتون نے کن کن فنون میں کمال پیدا کیا تھا۔

بقراط

اس سے پیشتر ہم نے جتنے لوگوں کے حالات لکھے ہیں وہ سب حکیم اور فلسفی تھے۔ مگر اب ہم ایک ایسے نامی گرامی شخص کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جو نہ حکیم تھا نہ فیلسوف بلکہ صرف ایک طبیب تھا۔ اور حکیم تھا بھی تو انہین معنون میں جن معنوں میں کہ ہماری زبان میں بیماریون کا علاج کرنے والے "حکیم صاحب" کہلاتے ہیں۔ لیکن جس طبیب کو ہم نے اُس کے حالات زندگی لکھنے کے لئے منتخب کیا ہے۔ وہ طبیب بھی ہے۔ تو اتنا بڑا اور اس پایہ کا کہ دنیا کے تمام حکیم اُس کے پیرو ہیں اور اُسی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ علم طب کا وہی موجد و بانی تھا۔

موجودہ یورپین تاریخ اہل یونان کی تحریرین اور عرب مورخین سب کو اتفاق ہے کہ **بقراط** ہی دنیا میں پہلا شخص ہے جس نے دوا اور علاج کے فن کو علم طب بنایا اس کو یہ وسعت دی۔ اور ہر جگہ اور ہر ملک میں کثرت سے طبیب پیدا کر دیئے۔

بیماریون کی دوا کرنا۔ اور دفع مرض کے طریقے معلوم کرنا فطرتی چیز ہے جب سے انسان دنیا میں آیا جب سے وہ بیمار ہوا اُسی وقت سے اُسے علاج کی بھی فکر ہوئی مگر ابتدا گر درد و مرض میں نفع بخشنے والے چٹکلے خدا کی رحمت و نعمت بدلیہ خیال کئے جاتے تھے

اور ان کا معلوم ہو جانا کی خاص مہربانی بلکہ الہام و وحی تصور کیا جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چیزین اب بھی اور حقیقت میں خدا کی برکت و عنایت ہیں۔ مگر اس وقت یہ چیزین خلاف قیاس معجزے اور غیر معمولی نعمتیں سمجھی جاتی تھین۔ اور اب کوئی خلاف قیاس کرامت یا معجزہ نہین باقی رہیں۔

اسی وجہ سے ابتدائً ہر جگہ علاج کرنا اور دفع مرض کی تدبیرین بتانا مذہبی مقتداؤن کاہنون اور زاہدون کے ساتھہ مخصوص تھا۔ وہ لوگ انہیں کے ذریعے سے اپنی فضیلت جتاتے۔ اپنے آپ کو خدا کے مقبول بندہ ثابت کرتے۔ اور جو تدبیرین علاج کی معلوم ہو جاتیں انہین کیمیا کے نسخوں کی طرح مخفی رکھتے۔

یونان میں بھی یہ فن اسی عنوان اور اسی صورت سے شروع ہوا خصوص اسقلیبیوس نام ایک شخص سے جسے لوگ خدا جانتے کیا کچھہ مذہبی وقعت دیے رہے تھے اسقلیبیوس بھی اپنے معلومہ نسخون اور اپنے طرز علاج کو کسی پر ظاہر نہ کرتا تھا۔ اس کے بعد یہ فن اسی کے خاندان میں چلا۔ اور نہایت ہی مخفی رموز کیطرح نسلاً بعد نسل سینہ بسینہ چلا آتا تھا۔ اس خاندان کے وارث یونانیوں میں دینی اور دنیوی حیثیت سے معظم و محترم سمجھے جاتے تھے۔ اور امیر و غریب ہر شخص کے مرجع و مادی تھے۔ یہان تک کہ نوین پشت پہنچ کے قریباً سیس نام اسی خاندان کا ایک شخص یونان کا بادشاہ ہوگیا۔ مگر اب بھی فن طب ایک لعل بے بہا کیطرح انہیں لوگون کے خزانے میں تہا۔ اور بند تھا۔ الغرض تین سو سال کے اندر اٹھارہ پشتیں گذری تھیں۔ اور ان میں سات بڑے معزز گران پایہ اور معجز نما طبیب ہو چکے تھے کہ اٹھارھوین پشت میں **بقراط** پیدا ہوا جس کا نام زیب عنوان ہے۔ **بقراط** کا نام یونانی میں **الیقو قراطیس** تہا۔ مگر عربون نے تصرف کر کے اپنی زبان میں **بقراط** بنایا جو ان کے ذریعے سے ساری مشرقی دنیا میں پھیلا۔

بقراط کے باپ کا نام **ایراقلیدس** تھا۔ اور دادا کا نام **بقراط**۔ اس لئے کہ عربوں کی طرح یونانیوں میں بھی یہ رواج تھا کہ اکثر دادا اور پوتے کا ایک ہی نام ہوتا۔ اُس کی **فرکسیشا** نام ایک خوش نصیب عورت تھی جو حکیم **ایرہ قلیس** کے گھرانے کی بیٹی تھی اور جس کے بطن سے سنہ ۴۶۰ قبل مسیح میں یعنی ولادت حضرت سرور کائنات سے ایک ہزار تیس سال پیشتر یونان کے شہر **قو** میں **بقراط** پیدا ہوا۔ ابھی اچھی طرح ہوش و حواس نہیں سنبھالنے پایا تھا کہ باپ نے اپنا خاندانی علم سکھانا شروع کیا۔ چونکہ دادا ہنوز زندہ تھے لہذا انھوں نے بھی اپنی پختہ مغزی اور اپنے تجربوں سے اُسے سبق دیا۔ اکثر قواعد علاج اور ادویہ کے خواص اول تو صرف باپ دادا کی لوحوں پر لکھے ہوتے تھے اور چند تحریروں میں تھے بھی تو اس وضع سے ایسے مجہول اشاروں اور علامتوں میں۔ اور ایسے نامعلوم خط میں کہ جب تک بتاتے نہ جائیں کوئی پڑھ نہ سکتا تھا۔ الغرض عنفوان شباب ہی تھا کہ خاندانی رموز و تجربات کو حاصل کر کے **بقراط** ایک باکمال طبیب بن گیا۔ چنانچہ اُس کے حالات لکھنے والے مورخ کہتے ہیں کہ وہ پچانوے برس دنیا میں رہا جن میں سے صرف سولہ برس طالب علمی اور علم طب سیکھنے میں صرف کئے اور باقی زندگی اُستاد فن اور ایک باکمال طبیب کی حیثیت سے بسر کی۔

اُس نے غالباً باپ دادا کے مرنے کے بعد غور سے دیکھا تو علم طب بہت ہی تنزل کی حالت میں تھا۔ جاننے والے گنتی کے لوگ تھے۔ اور اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو ان چند لوگوں کے ساتھ یہ شریف اور ضروری فن بھی ختم ہو جاتے۔ علاوہ بریں اس نے خیال کیا کہ علم طب نوع انسانی کے لئے عام طور پر ضروری ہے۔ لہذا اُس کو بھی اسی حد تک عام ہونا چاہیئے جس حد تک کہ انسان بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے الغرض انہیں اسباب و امور کو سوچ کے **بقراط** نے کوشش کی اور اس

بات پر کمر باندہی کہ اس شریف فن کو عام کر دیے۔ اور جہان تک بنے اُس کے جاننے والون کی تعداد بڑھائے۔

ان دنوں رموز طبی کے ماہر صرف دو شخص تھے۔ ایک تو یہی **بقراط** جو یونان کے شہر **قو** میں تہا۔ اور دوسرا **دیمقراطیس** جو شہر ابدیر ا میں تھا۔ **دیمقراطیس** کی طبیعت پر فلسفہ اور حکمت کے الہیات اس قدر غالب آئے کہ زہد و تقوی میں منہمک ہو کے گوشہ نشین ہو گیا لہٰذا **بقراط** تن تنہا ہی اپنے اغراض کے پورے کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ توجہ کرتے ہی اُس کو ایک اور بات نظر آئی۔ وہ یہ کہ اس کے خاندان والے اطبا میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا اور اُسے خوف ہوا کہ یہ اختلاف منجر بفساد ہو کے فن طب ہی کو نہ مٹا دے اُس نے پہلا یہ کام کیا کہ مسائل طب اور رموز علاج کی کتابون اور عام فہم تحریرون میں مدون کرنا شروع کیا۔ پہلے اپنی بیٹی **مالانا ارسا** دو بیٹوں **تاسلس** اور **دراقن** کو اور ایک ذہین و طبیعت دار شاگرد **فولوبس** کو یہ فن سکہانا شروع کیا۔ پہر غریبوں اور فقیروں کے لڑکوں کو عام طور پر سکہانے لگا۔ تاکہ علم طب کے فوائد اور خاندان **اسقلیبیوس** کی برکت گھر گھر پہیل جائے اور اس صحت بخش چشمے سے ہر شخص یکسان طور پر فیضیاب ہو سکے۔

شہر **قو** میں اپنے مکان کے قریب اپنے ہی ایک باغ میں سب سے علیحدہ ایک جگہ مقرر کی جہاں مریض لا کے رکھے جاتے۔ اور اُن کے لیے تیمادار اور خدمت گار مقرر کیے جو ہر وقت مریضوں کی خبر لیتے رہتے۔ اُس مقام کا نام **اخسندوکین** رکھا جس کے معنے "بیمارستان" کے ہیں اور اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ **بقراط** وہ شخص جس نے دنیا میں سب سے پہلا شفاخانہ قائم کیا۔

درس و تدریس کے لئے اپنی اور اپنے شاگردوں کی مدد سے اُس نے تین درس گاہیں قائم کیں۔ ایک تو خاص شہر **قو** میں جہان خود رہتا تھا۔ دوسری

شہر رودس اور تیسری شہر قیندس میں ہیں۔ مگر جب دیکھا کہ علم طب جاننے والے کثرت سے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اور فن شریف **اسقلیبیوس** کے خاندان ہی سے نہیں بلکہ اُس کی گرفت سے بھی باہر ہوا جاتا ہے تو ایک عہدنامہ اور حلف نامہ مرتب کیا جسکے مطابق ہر طالب علم سے قول و قسم لے لیا جاتا تھا۔ وہ عہدنامہ سچ پوچھئے تو ایک طبیب کے لئے نہایت ہی ضروری چیز ہے اور چونکہ یونانی اطبامیں سے ہر متنفس **بقراط** ہی کے گھرانے کا شاگرد ہے اور اُسی کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ لہذا ہمیں ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ کہ اس عہدنامے کو تمام و کمال نقل کردیں۔ ہمارے اطبا کو ضرورت ہے۔ کہ اُسے پڑھیں اور اُس کے پابند بنیں۔ ورنہ وہ **بقراط** کے سچے پیرو اور شاگرد رشید نہ ہونگے۔ اُس کی عبادت حسب ذیل ہے۔

میں قسم کھاتا ہوں اُس پروردگار عالم کی جو پیدا کرتا اور مارتا ہے۔ اور شفاء اور ہر دوا کا خالق ہے۔ اور قسم کھاتا ہوں۔ **اسقلیبیوس** کی اور تمام اولیاء اللہ کی عام اس سے کہ وہ عورتوں میں ہوں یا مردوں میں۔ اور ان سب کو گواہ کرکے کہتا ہوں۔ کہ میں اس عہد کو پورا کرونگا۔ اس کی تمام شرطوں کو بجالاؤں گا اور اس علم فن میں استاد کو بجائے باپ کے سمجھوں گا۔ اپنی آمدنی میں سے اُس کی مدد کروں گا۔ اور اُسے جب کبھی روپے کی ضرورت ہوگی اپنے سرمائے سے اُس کی خدمت کرونگا۔ اور جو دولت اُس کے ورثے میں مجھے ملے گی اُس میں سب بھائیوں کو شریک سمجھوں گا انہیں اگر اس علم کے سیکھنے کی ضرورت ہوگی تو میں سکھاؤں گا۔ اور بغیر اس کے کہ اُن سے کچھ اُجرت لوں یا کوئی نئی شرط کروں۔ اپنی اولاد استاد کی اولاد اور اُن تمام شاگردوں کو جن سے حرمت طب کا عہد لیا گیا ہو اور جن سے یہ شرطیں لی جاچکی ہوں اُن سب کو دینیوں علموں اور اس علم کے تمام متعلقات میں اپنا شریک و سہیم سمجھوں گا۔ مگر غیروں کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوگا حتی الامکان

اپنے معالجات اور اپنی جملہ تدابیر میں میرا مقصود صرف یہی ہوگا کہ مریضوں اور بیماروں کو نفع پہنچاؤں۔ اور جو چیزیں اُن کے حق میں مضر ہوں یا جن سے اُن پر جور کرنا ملحوظ ہو اپنی رائے کے مناسب انہیں اُن سے منع کرتا اور روکتا رہوں۔ مجھ سے اگر کوئی سمی اور قاتل دوا مانگی جائیگی تو نہ دونگا۔ اور نہ کسی کو ایسی دوا کے استعمال کا مشورہ دونگا۔ اور نہ عورتوں کو کسی ایسی چیز کے قریب جانے دونگا جس سے اسقاط حمل کا اندیشہ ہو۔ اپنی تدبیروں اور اپنے اعمال طبی کی ضرورت سے اپنے نفس کو ہمیشہ پاک اور طاہر رکھوں گا۔ جس کے مثانہ میں پتھری پیدا ہوگئی ہو۔ اُسے بھی اپنے ہاتھ سے چاک کرکے نہ نکالوں گا۔ بلکہ اس کام کو انہیں لوگوں کے لئے چھوڑ دوں گا جن کا یہ کام ہے۔ میں جس گھر میں داخل ہونگا میری نیت یہی ہوگی کہ مریضوں کو نفع پہنچا دوں۔ ہر جور و فساد کے ارادے سے ہمیشہ اپنے آپ کو بچاؤں گا۔ عام اس سے کہ وہ مردوں کے متعلق ہو یا عورتوں کے متعلق۔ آزادوں کے متعلق ہو یا لونڈی غلاموں کے متعلق جن امور کو میں اثنائے علاج میں دیکھوں یا سنوں گا۔ اور وہ ایسے امور ہوں جو راز کی حیثیت رکھتے ہوں اور پوشیدہ ہوں۔ اُن کو راز سمجھ کے اپنے سینے میں رکھوں گا۔ اور کبھی کسی پر انہیں ظاہر نہ کرونگا۔ جو اس عہد و پیمان اور قول قسم کا پابند رہے اپنے علاجوں میں کامیاب ہو۔ اپنے تدابیر میں مقصدور اور بامراد رہے۔ اور ہمیشہ لوگ اس کی مدح و ثنا کریں۔ اور جو کوئی اس کے خلاف کرے اس کی حالت بھی اس کے خلاف ہو"

یہ ہیں شرطیں اور اقرار جن کی پابندی ہر علم طب سیکھنے والے کو کرنی پڑتی یہی **بقراط** کو ان ہدایات میں اور لوگوں کو ان اصول اخلاق کا پابند بنانے میں یہاں تک اہتمام تھا کہ اس قسم کے اقرار نامے لینے پر بھی اطمینان نہ ہوا۔ اور ایک

اور وصیت نامہ لکھ کے اپنے تمام پیروں میں پھیلا دیا۔ یہ اقرار نامہ کیسا ہے اطبا اور معالجوں یا علم طب حاصل کرنے والوں کے لئے ایک ضروری اور واجب التعمیل دستور العمل ہے۔ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

علم طب کے طالب علم کو چاہیئے کہ آزاد ہو۔ لمبا ہو۔ نوعمر ہو۔ متوسط القامت اور متناسب الاعضاء ہو۔ ذکی و ذہین ہو۔ خوش بیان ہو۔ مشورہ دینے میں اس کی رائے صائب ہو۔ پاک باز و متقی ہو۔ گناہوں اور معاصی سے بچتا ہو۔ شجاع ہو۔ حریص و طامع نہ ہو۔ غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو۔ اور نہ ایسا ہو کہ کبھی غصہ ہی نہ آئے۔ کند ذہن نہ ہو۔ بیمار کے دکھ درد کا شریک ہو۔ اس کے حال پر شفیق ہو۔ اور اس کے رازوں اور رموز کا محافظ رہے۔ اس لئے کہ بہت سے مریض ہیں اپنے مرض کے حالات بتا دیا کرتے ہیں۔ جو کسی اور کو ہرگز نہ بتائے سخت و سست سننے پر برداشت و تحمل سے کام لے۔ کیونکہ بعض مجنون اور مختل الحواس ہیں گالیاں دینے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ اس کی طبیعت کا فعل نہیں بلکہ اس کے مرض کا فعل ہے۔ سر کے بالوں کی حالت بھی متوسط ہو۔ یعنی نہ سر منڈوائے اور نہ بالوں کو اتنا بڑھائے کہ جوڑے اور چوٹی کی طرح باندھے جائیں۔ اسی اعتدال کی ضرورت ناخنوں میں بھی ہے۔ اس کے کپڑے سفید پاک اور نرم ہوں۔ نہ تیز چلے۔ اس لئے کہ یہ طیش دبرہمی کا خاصہ ہے۔ اور نہ بہت ہی آہستہ چلے اس لئے کہ یہ نفس انسانی کا نقصان ہے۔ مریض کے دیکھنے کو جائے تو چار زانو بیٹھے اور خاموشی سے اس کے حالات سنے۔ اور ان کے سننے میں بے لطفی اور گھبراہٹ نہ ظاہر کرے۔"

جالینوس کہتا ہے بقراط طب کے علاوہ علم ہیات و نجوم کو بھی ایسا

اچھا جانتا تھا کہ اُس کے ہمعصروں میں سے کسی کو وہ لیاقت نہیں حاصل تھی۔ جن ارکان سے کہ جسم انسانی کی ترکیب ہے۔ ان کو بھی خوب سمجھا ہوا تھا۔ اس امر میں بھی کامل مہارت رکھتا تھا کہ جن اجسام میں کون و فساد ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے۔ کیونکر ہوتا ہے۔ اور کن اسباب سے ہوتا ہے۔ ان امور سے واقف ہی نہ تھا بلکہ وہی پہلا شخص ہے۔ جس نے ان پر قوی اور قابل تسلیم دلیلین پیش کیں۔ اور اس بات کے ثبوت پیش سکئے کہ تمام حیوانات اور نباتات کے جسموں میں کیونکر صحت قائم رہتی ہے۔ اور مرض پیدا ہوتا ہے۔ تو کیونکر اور کیوں۔ اسی شخص نے سب کے پہلے امراض جسمانی کا استقراء و استنباط کیا۔ اور اُن کا علاج بتایا۔

زندگی بھر اُس کا اور کوئی کام نہ تھا کہ بجز اس کے کہ علم طب پر غور کرتا۔ اس کے قواعد ایجاد کرتا۔ بیماروں کا علاج کرتا۔ اور اُن کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتا۔ چنانچہ اپنی کتاب ابیدیمیا،، میں بہت سے مریضوں کے حالات اور اُن کی سرگذشتین بیان کی ہیں۔

سب سے بڑی یہ بات تھی کہ حرص و طمع نام کو بھی نہ تھی۔ دولت و ثروت کا ذرا بھی شوق نہ تھا۔ اور صرف اتنا ہی روپیہ چاہتا تھا جتنا اُس کے حوائج ضروری کے لئے کافی ہو سکے۔ چنانچہ اسی کی برکت تھی کہ بادشاہوں کی خدمت اور درباداری سے بھاگتا تھا۔ **جالینوس** کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ ایران اردشیر نے جو دارا ابن دار کا دادا تھا اور جسے یونانی **ارطخشت** کہتے ہیں سقراط کو اپنے دربار میں بلوانا چاہا۔ اور سبب یہ ہوا کہ اُن دنوں فارس میں ایک وبا نمودار ہوگئی تھی۔ اور اُس میں مبتلا ہو ہو کے ایرانی اس کثرت سے مرنے لگے کہ اردشیر نے گھبرا کے اپنے عامل **تو** کو لکھا کہ بقراط کے پاس سو قنطار سونا بھیجو۔ اور اُسے

راضی کر کے نہایت تعظیم و تکریم اور شان و شوکت سے کے ساتھ ادہر روانہ کرد۔ اُس پر
یہ بھی ظاہر کردو کہ یہ جو کچھ دیا گیا بمقابل اُس کے جو آئیندہ ملے گا بہت کم ہے۔ اور
اس مال و دولت کے علاوہ بہت سا علاقہ بھی دیا جائے گا" پھر اُس کے ساتھ
اردشیر نے فرمان روائے یونان کے نام بھی۔ اِس مضمون کا ایک خط بھیجا کہ بقراط
کے ادہر روانہ کرنے میں میری مدد کرو۔ اگر تم نے اس امر میں مدد دی تو سات
برس تک تم امن و امان میں رہو گے اور ادہر سے تم پر کوئی حملہ نہ کیا جائے گا۔
الغرض یہ امور بقراط کے سامنے پیش ہوئے مگر اُس نے جانے سے صاف
انکار کردیا۔ بادشاہ یونان کی چونکہ خود بھی غرض تھی لہذا اُس نے اصرار کیا۔ اور بالحاح
بھیجنے کی کوشش کی۔ جس کے جواب میں سقراط نے یہ مختصر جواب دیا کہ میں مال و
دولت کے معاوضے میں فضیلت و علم کو نہیں خرچ کر سکتا"

پھر اس کے بعد جب یونان کا بادشاہ **بروقلیس** بیمار ہوا تو اُس کے پاس
بھی بقراط کبھی نہیں گیا۔ بلکہ اُسے چھوڑ کے مسکینوں اور غریبوں کے علاج میں
مشغول رہا۔ اور انہیں غربا کے علاج کے شوق میں اُس نے تمام بلاد یونان کا
دورہ کیا۔ اور اس قدر پھرتا پھراتا رہا کہ اسی سفر کے تجربات سے فائدہ اٹھا کے
اس نے اپنی وہ کتاب تصنیف کی جو یونان کے شہروں اور قریوں کی آب و
ہوا پر ہے۔

بعض مورخین کا بیان ہے۔ کہ بقراط بہمن بن اردشیر کے عہد میں بھی تھا۔
ایک مرتبہ یہ فرمان روا بیمار ہوا۔ اور اُس نے خاص اپنے علاج کے لئے بقراط
کے بلانے کی کوشش کی۔ اور اہل **قو** یعنی بقراط کے وطن والوں کو لکھا کہ جس طرح
بنے اُسے میرے دربار میں روانہ کرد۔ مگر شہر والے اُس کے نام پر اس قدر
شیدا تھے اور اُس کی خوبیوں کے ایسے عاشق تھے کہ ایسے گران پایہ طبیب کا جانا

کسی طرح گوارا نہ کیا۔ اور بہمن کو لکھ بھیجا کہ ہم اُسے نہیں بھیج سکتے۔ لیکن اگر زبردستی بلایا گیا تو قبل اس کے کہ اُس کا قدم ہمارے شہر سے نکلے ہم سب لڑکے مرجائیں گے۔ یہ سن کے بہمن کو ترس آیا۔ اور اپنے ارادے سے باز آگیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اردشیر کے وقت تک بقراط کے وطن شہر قو پر فرمان روائے یونان کا قبضہ تھا۔ اور اب بہمن کے دور میں یہ شہر سلطنت فارس کی قلمرو میں شامل ہوگیا تھا۔

یہ عجیب وغریب واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ **بقراط** کے زمانے میں **اقلیمون** نام ایک حکیم قیافہ شناسی کا مدعی تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ جس شخص کا حلیہ دیکھے یا سنے اُس کے اخلاق وعادات کو بتا دے گا۔ بقراط کے شاگردوں نے ایک دن باہم بیٹھ کے کہا اب اس وقت روئے زمین پر بقراط سے زیادہ نیک نفس اور لائق کوئی شخص نہیں آؤ اس حکیم سے اس کا حلیہ بیان کرکے پوچھیں۔ دیکھیں کیا کہتا ہے۔ چنانچہ اقلیمون کے پاس گئے اور بقراط کا پورا حلیہ بتا کے کہا فرمایئے ایسے شخص کے اخلاق کیسے ہوں گے اُس نے غور وتامل کرکے کہا "وہ ایسا شخص تو چاہیئے کہ زانی وشہوت پرست ہو" طلبہ نے کہا آپ نے غلط بتایا یہ حلیہ بقراط کا تھا جس کی نیک نفسی وپارسائی کو زمانہ جانتا ہے۔ یہ سن کے اقلیمون نے کہا تم جو چاہے خیال کر دیں تو اب بھی وہی کہتا ہوں جو کہہ چکا طلبہ وہاں سے واپس آئے اور ساری سرگذشت بقراط سے بیان کی۔ اُس نے سن کے کہا "وہ اقلیمون نے سچ بتایا میری طبیعت زنا وشہوت پرستی کی طرف بہت زیادہ مائل ہے۔ مگر ہاں خدا نے مجھے اپنے نفس پر قابو دیا ہے۔ جس کی وجہ سے کبھی اس کی خواہشوں پر عمل نہیں کرتا۔"

چونکہ بقراط کے حلیے کا ذکر آیا لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ناظرین اُس کی تصویر بھی دیکھ لیں۔ اور خیال کریں کہ علم طب کے پہلے موجد و مدون کی صورت کیسی ہے۔ وہ ایک متوسط القامت۔ گورا چٹا۔ اور خوش رو شخص تھا۔ آنکھیں شربتی۔ ہڈیاں بڑی بڑی اور چوڑی۔ سارے پنڈے میں اعصاب یعنی پٹھون کی کثرت۔ متوسط درازی کی سفید نورانی ڈاڑھی۔ پیٹھہ ذرا خمیدہ۔ اور سر بڑا۔ آہستگی و وقار کے ساتھہ حرکت کرتا ہے۔ جدہر پھرتا ہے سارے جسم سے پھر جاتا ہے۔ اکثر سر جہکائے ہوئے نظر آتا ہے۔ جو بات کہتا ہے گفتگو میں نرمی ہے۔ اور جب بات کرتا ہے سمجھانے کے لئے مکرر سہ کرر کہتا ہے۔ جب کسی صحبت میں بیٹھتا ہے۔ تو جوتیان آنکھون کے سامنے رکھی رہتی ہیں۔ اُس کی نظر اکثر زمین پر رہتی ہے۔ اور گفتگو میں کسی قدر مذاق بھی ہے اکثر روزہ رکھتا ہے۔ اور روزہ نہ ہو تو بھی غذا میں تقلیل کرتا ہے اور آپ جب دیکھین گے اُس کے ہاتہہ میں یا تو نشتر ہوگا یا سُرمہ لگانے کی سلائی۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ عمل جراحی بھی اپنے ہاتہہ سے کرتا تھا۔ لیکن اس سے پیشتر جو عہد نامہ نقل کیا گیا ہے۔ اُس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے اور اپنے شاگردوں کے لئے اس کام کو ناپسند کرتا تہا۔ جیسا کہ اطبا سے یونانی میں مروج ہے۔ کہ صرف دوا اور تدبیر بتا دینا اطبا کا کام ہے۔ اور چیرنا پہاڑنا یا نشتر دینا جراحون کا کام۔ اس کے ساتہہ انگریزی مورخیں کا بیان ہے۔ کہ وہ طبابت اور جراحی دونو کام کرتا تہا۔ ان اختلاف کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ بیشک وہ جراحی بھی کرتا تہا۔ مگر ایک محدود حد تک۔ اور عموماً اُن دنوں چیرنا پہاڑنا طبیبون کے علاوہ اور لوگون کا کام تہا۔

آخر ایک طولانی عمر پا کے اور فن طب کو اعلیٰ درجۂ کمال پر پہنچا کے بقراط

نے ۳۶۱ سنہ قبل مسیح میں یعنی حضرت مابدولت سے نو سو اکتیس ۹۳۱ سال پیشتر سفر آخرت کیا۔ کہتے ہیں۔ کہ اس کا مرض موت فالج تھا۔ مرتے وقت تیمار داروں کو ہاتھی دانت کا ایک ڈبا دیا۔ اور وصیت کی کہ اُسے میرے ساتھ۔ قبر میں دفن کر دینا۔ چنانچہ وہ ڈبا اس کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ اور کسی کو خبر نہ ہوئی کہ اس میں کیا تھا۔ ایک زمانے کے بعد اتفاقاً روم کا قیصر اُس کی قبر پر سے گذرا۔ اور یہ معلوم کر کے کہ یہ قبر بقراط کی ہے۔ متاثر ہوا۔ اور اس قدر جوش اُس کے دل میں پیدا ہوا کہ حکم دیا قبر از سر نو بنوادی جائے۔ اس لئے کہ مرور زمانہ سے وہ بالکل شکستہ ہو رہی تھی۔ بنانے اور مضبوط بنیاد قائم کرنے کے لئے قبر کو کھوادیا تو وہ ہاتھی دانت کا ڈبا ملا۔ قیصر نے اُسے کھول کے کے دیکھا تو اُس میں ایک چھوٹا رسالہ تھا جس میں پچیس ۲۵ ایسے امراض لکھے ہوئے تھے جن سے انسان ہرگز نہیں بچ سکتا۔ اور اُن کے ظاہر ہوتے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ اتنے دنوں اور اتنے زمانے کے بعد مریض مرجائے گا۔ یہ رسالہ عربی میں ترجمہ ہوا۔ اور عام طور پر ملتا ہے۔ قانونچے کے آخر میں چھپا ہوا ہے۔

انگریزی مورخین لکھتے ہیں کہ وہ علم طب کا موجد تھا۔ اسباب مرض پر بہت کامل غور کرتا تھا۔ نسخے میں بہت سادی اور اکثر مفرد دوائیں لکھتا تھا۔

اس اصول کا پہلا مدعی وہی ہے۔ کہ طبیب کو طبیب کی پیروی کرنی چاہیئے وہ طبیب بھی تھا اور جراح بھی تھا۔ مگر یونانیوں میں چونکہ مُردوں کی بہت تعظیم . . . . . . کی جاتی تھی۔ لہذا التشریح میں اُس کا علم محدود تھا۔ اُس کے تصانیف کا مکمل مجموعہ جرمنی میں چھپ گیا ہے۔

بقراط کی اصل میں تیس ۳۰ کتابیں ہیں۔ جن میں سے دس ۱۰ زیادہ مشہور مرتب

اور درس میں داخل تھیں ۔ مگر خیال کیا جاتا ہے ۔ اور قرین قیاس بھی یہی ہے کہ یہ سب کتابیں اُسی کی تہیں بلکہ ان کا اصول و فروغ اور تجربات و نسخ کا مجموعہ یہ ہے ۔ جو اسقلیبیوس سے لے کے اُس کے عہد یعنی تین سو برس تک مرتب ہوتے رہے ۔ اور نہایت مخفی رازوں کیطرح عام نگاہوں سے پوشیدہ رکھے گئے ۔ بقراط نے اس فن کے عام کرنے کے لئے اُن تمام رموز کو یکایک اپنی تحریروں سے ظاہر کر دیا ۔

اس کے بعد علم طب کے ماہر اور بتانے والے اُس کے دو بیٹے ۔ دو پوتے ۔ ایک بیٹی ۔ اور دس یا بارہ شاگرد تھے ۔ جن سب میں اُس کی بیٹی **مالاتا ارسا** ۔ کو بہت زیادہ کمال اور تجربہ حاصل تھا ۔ اور اپنے باپ کے کمالات کی سچی وارث وہی تھی ۔

مانی

ہمارے ملک میں اور ہماری زبان بولنے والوں میں کون ہوگا ۔ جس نے شعرا کے کلام کو پڑھا ہو اور مانی کا نام نہ سنا ہو جو مصوری اور نقاشی کا سب سے بڑا کامل نمونہ اور اتنا بڑا باکمال مانا جاتا ہے ۔ کہ کوئی مصور چاہے کتنا بڑا مصور ہو جائے ۔ مگر ملک کے خیال میں **مانی** کے درجہ سے نہیں بڑھ سکتا ۔ مگر افسوس کہ سارے ہندوستان میں شاید شاذونادر ہی کوئی جانتا ہوگا کہ مانی کون شخص تھا ؟ کس زمانے میں تھا ؟ کیا کرتا تھا ۔ کہاں رہتا تھا ؟ اور کیونکر اور کہاں مرا ؟ واقعی ہمارے لٹریچر کا یہ بہت بڑا نقصان ہے کہ ہم ان لوگوں کے حالات سے بہت ہی کم واقف ہیں ۔ جن کے نام بار بار ہماری زبان پر آتے ہیں ۔ ہمارے قلموں سے نکلتے ہیں ۔ اور جو ہماری انشا پردازی

کا زیور بنے ہوتے ہیں۔ ہم نے اس بات کی کوشش شروع کی ہے کہ ایسے تمام لوگون کے حالات سے پبلک کو واقف کردیں۔ چنانچہ ہم بہت سے لوگون کے حالات شایع کرچکے اور اب اسس مشہور ومعروف نقاش عجم کے سوانحعمری کیطرف توجہ کرتے ہیں

مانی ایک ایرانی نژاد اور مجوسی الاصل شخص تہا۔ اگرچہ اُس کا سنہ ولادت ہمیں معلوم نہیں مگر اس میں کچھہ کلام نہیں کہ اسکا نشو ونما اور عروج تیسری صدی عیسوی میں یعنی حضرت رسالت صلعم سے تقریبًا تین سو برس پیشتر ہوا۔ سپانے اُن کے استادوں سے سیکھہ کے اور تیز اپنی ذاتی طباعی و مناسبت سے کام لیکے فن مصوری میں اسس درجے کو پہنچ گیا کہ سارے ملک میں کوئی شخص ہمسری کا دعوی نہ کرسکتا تھا۔ لیکن اُس کے کمالات صرف اسی فن پر محدود نہ تھے علمی ذوق نے اُسے جتنا بڑا مصور بنایا تھا اتنا ہی بڑا فلسفی اور اسی درجے کا ہیات دان اور نجومی بھی بنادیا۔ الغرض علوم فلسفیہ اور الہیات میں غور و تدبر کرنے کے ساتھہ اُس نے دنیا کی پولٹیکل اور سوشیل حالت دیکھی اور کوشش کی کہ ان مذہبی جھگڑوں کو مٹا کے دنیا کو ایک اصول کا پابند بنانے کی کوشش کرے۔

اُن دنوں دنیا کی پولیٹکل حالت یہ تہی کہ ممالک مشرق میں باوجود بڑی کوششوں کے دین عیسوی کو کسی طرح کامیابی نہ حاصل ہوتی تہی۔ مغرب میں تو مسیحیت بحر اعظم مغرب کے سواحل تک جا پہنچی تھی۔ مگر مغرب کی طرف زرتشتی نے اسے ایسا روکا کہ کسی طرح دریاے فرات و دجلہ سے آگے نہ بڑہنے پاتی تھی۔ جہاں کے سرحدی اضلاع وصوبجات میں پولٹیکل انقلابات کے دامن میں چھپ چھپ کے دین علیسوی اور دین زرتشتی

لڑ رہے تھے۔ چنانچہ ارمینیہ۔ جو ایران و روم کا سرحدی صوبہ تھا اس قسم کی عظیم الشان معرکہ آرائیوں کا دنگل اور بڑی بڑی سازشوں کا مرکز بن گیا۔ یہاں کا فرمانروا ایک عیسوی واعظ کی تلقین سے عیسائی ہوگیا تھا۔ لیکن جب دولت عجم کے ساسانی تاجدار کو یہ حال معلوم ہوا۔ تو اس نے اُس مسیحی حاکم کو قتل کرکے پہلی آتش پرستی قائم کردی۔ اتفاقاً اب مسیحیت کے فروغ پانے کا یہ ایک نیا سلسلہ جاری ہوگیا کہ خاص ساسانی خاندان کا ایک شاہزادہ اور ایک شاہزادی جو خسرو دخت کہلاتی تھی۔ کسی پادری کی صحبت میں بیٹھ بیٹھ کے عیسائی ہوگئے۔ اور اُن کی کوششوں سے پھر مسیحیت آرمینیہ میں فروغ پانے لگی۔ اگرچہ اب بھی تاجداران عجم نے عیسائیوں پر بہت کچھ ظلم و جور کیا مگر اب مسیحیت کا قدم آرمینیہ میں جم گیا تھا۔ اور اُس کو مٹانا غیر ممکن تھا۔

یہ انقلابات یہ کشت و خون اور یہ خرابیاں دیکھ کے **مانی** کو خیال ہوا۔ کہ کوئی ایسی کوشش کرنی چاہیے جسکی بدولت یہ جھگڑے مٹ جائیں اور ایران و روم دونوں کسی نئے اصول کے تابع ہوں۔ ان اصول کو اُس نے اپنے علم و فضل کے زور اور حسن تدبیر سے خود ہی قائم کرنا شروع کیا۔ مگر تاریخ سے بہت سی شہادتیں مل سکتی ہیں۔ کہ ایسی کوششوں کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوا ہے۔ کہ بعوض اس کے کہ مذہبی اختلاف مٹے ایک نیا مذہب پیدا ہوگیا۔ اور جھگڑے بجائے مٹنے کے اور بڑھ جایا کئے۔ چنانچہ یہی نتیجہ **مانی** کی ان کوششوں کا بھی ہوا۔

اپنے جدید مذہب کو ہنوز تیار اور مضبوط نہیں کر چکا تھا کہ اپنی کوششوں میں اثر پیدا کرنے کے لئے اس نے ارادہ کیا کہ دولت ساسانی میں رسوخ پیدا کر کے اپنے ہاتھ میں حکمرانی کی قوت پیدا کرلے۔ اور دولت عجم کو بھی اپنے جدید

کیش دائین کا حامی بنائے اور چونکہ بہت بڑا لائق و فائق شخص تھا ہر جگہ اُسکے
علم و فضل کا شہرہ تھا لہذا اس غرض میں اُسے بہت آسانی سے کامیابی ہو گئی۔
اور شہنشاہ ایران **شاپور اوّل** کے دربار میں پہنچ کے سارے ملک میں عزت
و وقار کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اب یہ عزت و وقعت حاصل کرنے کے بعد مذہب
متعلق اُس نے اپنے آزادانہ اور مصلحت آمیز خیالات ظاہر کرنا شروع کئے تھے
کہ ایران کے تمام کاہنوں اور ملت زرتشتی کے معتقداوں نے بڑے
زور و شور سے مخالفت کی۔ ایران میں باوجودیکہ شاہنشاہی سطوت کے آگے
ہر شخص کو غلاموں کی طرح سر جھکانا پڑتا تھا مگر مذہب کا زور اس قدر بڑھا ہوا تھا۔
کہ اُس کے مقابلے میں بادشاہ سے بھی کوئی مدد نہ مل سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ
مانی کو سخت ناکامی ہوئی۔ اور ایسی ناکامی کہ دربار خسروی درکنار وطن کو بھی
خیرباد کہنی پڑی۔

مگر ایسی ناکامیاں اس طبیعت کے لوگوں کے لئے عموماً بجائے ضرر رساں
ہونے کے ہمیشہ مفید ہوا کی ہیں۔ **مانی** دربار ساسانی سے نکلا تو سیدھا
ارض مشرق کو روانہ ہوا پہلے ترکستان میں گیا۔ وہاں کی قوموں اور ان کے
مذہب کو دیکھا۔ پھر ہندوستان اور چین کا سفر کیا۔ یہاں کے مذاہب اور
ان کے اصول الٰہیات میں بصیرت حاصل کی۔ بودھ مذہب کی حقیقت دریافت
کی۔ برہموں کے اخلاقی و مذہبی اصول دیکھے۔ اور ان سب امور میں پورا
کمال حاصل کر کے ترکستان میں واپس آیا اور اب یہاں پہنچ کے اُس نے ایک
سنسان گھاٹی میں جا کے خلوت اختیار کی۔ اس جگہ ایک شفاف چشمہ جاری تھا
اور جا بجا میوہ دار درختوں کے موجود ہونے سے کھانے کے لئے بھی پورا
اطمینان تھا۔ اس وادی میں وہ کامل ایک سال تک بیٹھا رہا۔ اور اُسی

خلوت کدے میں اُس نے اپنی کتاب **ارتنگ** تیار کی۔ اور جس طرح حضرت موسیٰ چالیس دن بعد کوہ طور پر سے **توراۃ** کی لوحیں لے کے آئے تھے اسی طرح وہ اپنی اُسی کتاب کو لے کے برآمد ہوا۔ اور آتے ہی لوگوں سے کہا "میں خدا کے پاس سے آیا ہوں جس نے مجھے مبعوث بہ نبوت کیا ہے۔ اور یہ آسمانی کتاب وہی ہے۔ جس کتاب پر ساری دنیا کو عمل کرنا چاہیئے۔ دیگر آسمانی کتابوں کے خلاف اس کتاب میں نہایت ہی اعلیٰ درجے کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ جو اُس زمانے کے اعتبار سے اتنی بڑی اعلیٰ چابک دستی اور ایسی صناعی کا ثبوت دیتی تھیں کہ انسانی قوت سے بالا بتائی گئیں۔ اور انھیں کو اُس نے اپنی اُس کتاب کے آسمانی ہونے کا معجزہ اور ثبوت قرار دیا۔

فارسی و اُردو شاعری و انشا پردازی میں **مانی** محض ایک مصور مشہور ہے غیاث اللغات کے مصنف نے خدا جانے کس بنیاد پر اسے ایک رومی نژاد مصور بنایا ہے۔ جو بالکل بے اصل ہے۔ اس کے حالات میں لکھا ہے۔ کہ اُس کے اس کمال کی مصوری ہی کو اپنا معجزہ قرار دے کے دعوائے نبوت کیا۔ اس کے اس کمال کی نسبت مولانا **نظامی** نے سکندر نامے میں چند ایسے واقعات لکھے ہیں۔ جو غالباً ان دنوں ایرانیوں میں مشہور تھے۔ کیونکہ قدیم تاریخوں میں ان باتوں کا پتہ کہیں نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ **مانی** نے نقاشان چین کے اعلےٰ کمال نقاشی کا شہرہ سن کے **چین** کا سفر کیا۔ اُس کی روانگی کا حال چینیوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک اندھے کنوئیں کی تہ میں جو اُس کے راستے میں پڑنے والا تھا، ایک آئینہ بنا دیا جو پانی کا دھوکا دیتا تھا۔ **مانی** وہاں پہنچا۔ اور پانی اور شیشہ کا امتیاز نہ کر سکا۔ چنانچہ پانی نکالنے کے لئے اس کنوئیں میں ڈول ڈالا۔ مگر جب پانی کی ٹھیس سے شیشہ ٹوٹ گیا تو اپنی غلطی پر اُسے بڑی ندامت ہوئی۔ سمجھا کہ

چینی مصوروں نے تجھے دہوکا دینے کے لئے یہ چالاکی کی ہے۔ فوراً کنویں میں اُترا اور اس شیشے کی جگہ اب اُس نے ایک مرا اور سڑا ہوا کتا بنا دیا جس میں اوپر سے کیڑے بھی بلبلاتے نظر آتے تھے۔ اور اس صنعت سے اُس کا یہ مطلب تہا کہ اوّل تو چینیوں کی معاندانہ کارروائی کا جواب ہو جاتے تو پھر کوئی راہ چلتا اس کنویں میں پانی لینے کے لئے ڈول نہ ڈالے۔ اس کے بعد جب وہ چین میں پہنچ گیا تو نقاشان چین سے اُس سے مقابلہ ہوا۔ قدردان بادشاہ یا اُمرا نے مقابلے کی یہ صورت نکالی کہ آمنے سامنے کی دو دیواریں۔ **مانی** اور **چینی نقاشوں**۔ کو دی گئیں کہ اُن پر اپنے اپنے فن کا کمال دکھائیں۔ اور درمیان میں ایک اور دیوار اٹھا دی کہ جب تک دونوں کی طرف کی تصویریں تیار نہ ہو جائیں کوئی اپنے حریف کی کارگیری سے مطلع نہ ہو۔ چینیوں نے بڑی محنت و سرگرمی سے اپنی دیوار کو عجیب و غریب تصویروں کا مرقع بنا دیا۔ مگر **مانی** نے صرف اتنا کیا کہ اپنی دیوار کو خوب گھونٹ گھونٹ کے آئینہ بنا دیا۔ اور اس پر ایک پردہ ڈال رکھا۔ جب دونوں نے کہا کہ اب ہم اپنی تصویریں بنا چکے تو ممتحن اور مقابلہ کرنے والے آ کے کھڑے ہوئے۔ دیوار بیچ سے توڑی گئی۔ چینیوں کی صنعت کی تعریف کی گئی۔ اور اب مانی نے اپنی دیوار سے پردہ ہٹایا تو جو تصویریں چینیوں نے بنائی تھیں۔ اُن کا عکس مقابل کی دیوار پر پڑا۔ اور معلوم ہوا کہ **مانی** نے بغیر دیکھے اُن کے مرقع کی نقل اس کمال کے ساتھ اُتار لی ہے کہ کسی بات میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ سبھوں نے اُس کی بے انتہا تعریف کی اور عش عش کرنے لگے۔ یہ واقعات اس قسم کے ہیں کہ انکی ایک کہانی سے زیادہ وقعت نہیں معلوم ہوتی

بہرحال اس سفر اور اپنی ترکستان کی مذکورہ خلوت گزینی سے فراغت

کر کے جب وہ **ایران** میں واپس گیا تو اپنے کو ایک صاحب کتاب پیغمبر بنا رہا تھا۔ اب ایران میں آتے ہی اُسے نمایاں کامیابی ہونے لگی۔ بہت سے لوگ اس کے معتقد اور پیرو ہو گئے۔ علمائے زرتشتی سے اس سے بڑے بڑے مناظرے ہوئے اس زمانہ میں **شاہ پور** اول دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اور اُس کی جگہ اس کا **بیٹا ہرمز بن شاپور** تخت و تاج ساسانی کا مالک تھا۔ ہرمز نے اس کی بڑی قدر و منزلت کی علم و فضل کی قدر دانی کر کے اس پر نہایت ہی مہربان ہوا۔ اور علاقہ **بابل** میں **ارابیون** نام ایک قلعہ اُسے رہنے کو دیا۔

اس قلعے میں بیٹھ کے **مانی** نے اپنے نئے مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ اور اس کامیابی کے ساتھ اپنے مذہب کو شایع کرنے لگا کہ ہزار ہا آدمی اُس پر ایمان لے آئے۔ اور مذہب **مانوی** روز افزوں ترقی کرنے لگا۔ **مانی** کا مذہب بادی النظر میں دین عیسوی کی شاخ معلوم ہوتا ہے۔ مگر اصل میں وہ دنیا کے تمام مذہبوں سے مرکب تھا۔ بظاہر مسیحیت کو مذہب حق تسلیم کر کے اس نے تمام مشرقی مذاہب کے فلسفۂ الٰہی کو اپنا دستور العمل بنا لیا تھا۔ وہ وحدت وجود کے مسئلہ کا حامی اور مدعی تھا تخلیق عالم کی نسبت کچھ نئے اور عجیب خیالات ظاہر کئے تھے۔ آتش پرستوں کے اصول کے مطابق اصلی بنا دو خداؤں یزدان **واہرمن**۔ پر قائم کی۔ اور انہیں کے نتیجے میں **نور و ظلمت**۔ کی اصطلاحوں سے بھی کچھ مذہبی اور روحانی کام لیا۔ حضرت مسیح کی نبوت کو تسلیم کیا۔ اور اُن کے پیشتر کے انبیا خاصۃً حضرت موسیٰ کی نبوت سے قطعًا انکار کر دیا۔ جس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ یہودیت سے کسی قسم کا علاقہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ یہودیت میں اس قدر تنگ خیالی تھی۔ اور وہ مذہب ایک قوم اور ایک خاص سرزمین اور ہزارہا قسم کی سخت قیود کے ساتھ اس قدر وابستہ تھا

کہ وہ تمام سننے باتیں مذاہب جنھوں سے نے حضرت مسیح کے بعد دین میں کوئی اجتہاد و تغیر کرنا چاہا۔ سب کے سب دین موسوی کے خلاف تھے۔ **مانی** نے اپنے مذہب کے لئے اخلاقی اصول بالکل **بودہ** مذہب کے اخلاقی فلسفہ سے لئے۔ اور اسی سلسلے میں بعض باتیں ہندوستان کے اس مذہب سے بھی لیں۔ جو **برہمنوں کا مذہب** ہے۔ الغرض **مانی** کے مذہب کی حقیقی شان یہ تھی کہ **ثنویت** کے یزدان واہرمن اور **چین وہند** کے اخلاقی فلسفہ کو **عیسویت** کا جامہ پہنا دیا گیا۔ کتاب عہد عتیق (توراۃ) کو اس نے شیطانی وسوسوں کو نمونہ بنایا۔ اور چند ان انجیلوں کے ساتھ جنھیں مسیحی جعلی بتاتے ہیں **مانی** کی کتاب **ارژنگ** اس نئے دین کا دستور العمل قرار پائی۔ مگر باوجود اس کے کہ **مانی** نے مختلف مذاہب سے التقاط اور انتخاب کیا تھا بھی **زرتشتیت** غالب تھی۔ کیونکہ **مانی** کہتا ہے۔ عالم مصنوع اور دو قدیم وہ ازلی اصلوں سے مرکب ہے۔ ایک نور اور ایک ظلمت۔ یہ دونوں اصلی چیزیں ازلی ہیں۔ ہمیشہ تھیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ ان میں ہمیشہ سے حس عقل اور دیکھنے سننے کی قوت تھی اور ہمیشہ رہیگی۔ یہ دونوں باعتبار ذات صورت فعل اور تدابیر کے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور بالحاظ اپنے اپنے حیز کے ایک دوسرے کی مقابل ہیں۔ بعینہ اسی طرح جیسے کہ کسی چیز کا سایہ اسکے مقابل رہا کرتا ہے اور جتنی خوبیاں اور بھلائیاں ہیں سب نور کی طرف منسوب ہیں اور جتنی برائیاں اور خرابیاں ہیں۔ سب ظلمت کی طرف منسوب ہیں۔

تاہم مشرقی مذاہب کے ان خیالات و عقائد کے ساتھ اس نے انجیل سے یہ فائدہ اٹھایا کہ **فارقلیط** جس کے ظہور کی بشارت حضرت مسیح نے دی تھی اور مسلمان جس کا مورد حضرت محمد صلعم کو بتاتے ہیں خود اپنے آپ کو

بتایا۔ اور علانیہ کہ دیا کہ "حضرت عیسیٰ نے میرے ہی آنے کی پیشین گوئی کی تھی
لیکن حیرت کی یہ بات ہے۔ کہ مانی نے اگرچہ اپنے مذہب میں سب سے
زیادہ اصول آتش پرستی ہی کو قائم رکھا تھا۔ مگر سب سے زیادہ ضرر اور صدمہ
اُسے خاص زرتشتیوں ہی کے ہاتھ پہنچا۔ علمائے **مجوس** اُس کے مخالف
اور دشمن ہوتے جاتے تھے۔ جب تک **ہرمز بن شاپور** زندہ رہا اُس وقت
تک تو اُسے کچھ نقصان نہیں پہنچا۔ اس لئے کہ وہ اس کا دوست تھا۔ اور
اسی کی مہربانی سے قلعۂ **ارابیون** میں بیٹھ کے اُسے اپنے مذہب کے
شایع کرنے کا موقع ملا تھا۔ مگر جب ہرمز کے بعد اُس کا بیٹا **بہرام** شہنشاہ
ایران ہوا تو اُسے آتش پرستوں کے **موبدوں** اور **دستوروں**
نے اس قدر ابھارا کہ وہ **مانی** کا دشمن اور اُس کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ آخر
حضرت مسیح کے ۲۷۷ء برس بعد اور حضرت محمد صلعم سے ۲۹۳ سال پیشتر وہ
اپنے قلعے سے گرفتار کر کے **بہرام** کے سامنے لایا گیا جس نے یہ نہایت ہی
سخت سزا دی کہ زندگی ہی میں اُس کی کھال کھنچوا لی۔ اور اس میں بھس بھروا دیا
مانی کی کھال کا یہ پُتلا اپنی مظلومی کی تصویر دکھانے اور تعصب مذہبی کے
ظلموں کے کارنامے ظاہر کرنے کے لئے ایک مدت تک **شہر شاپور** کے
پھاٹک پر جو ان دنوں **ساسانیوں** کا دارالسلطنت تھا رکھا رہا۔

لیکن **مانی** نے اپنی زندگی ہی میں اپنے مذہب کو اس قدر فروغ دے دیا
تھا۔ کہ اُس کے بعد پورے استقلال کے ساتھ قائم رہا اور چند ہی روز میں اُس نے
اس قدر عروج حاصل کر لیا کہ **کیتھولک** مسیحیت یعنی **پولوس** کے
پیرووں کے مقابلے میں ایک مستقل اور زور دار مذہب بن گیا۔ اور
رومی کلیسا کا سب سے زبردست حریف یہی فرقہ تھا۔ **مانوی**

لوگ اپنی توحید پر نازاں تھے۔ اپنے مخالف عیسائیوں کو شرک و بت پرست بتاتے تھے اور جو انتظامات کہ رومی کلیسا کی ترویج کے لیے عمل میں آتے تھے وہی انتظامات زیادہ قوت اور اثر کے ساتھ مانویوں میں بھی قائم ہو گئے۔ چنانچہ بارہ بڑے عہدہ دار **رسولوں** اور **حواریوں** کے نام سے معین ہوتے اُن کے ماتحت ۷۲ **بشپ** یعنی اُسقف اعظم تھے پھر ان کے زیر حکم **پریسبیٹر** اور **ڈیکن** تھے جو سفر کرتے اور ہر طرف شہروں شہروں اور قریوں قریوں دین **مانوی** کو تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔

مانی کا قائم کیا ہوا دین **مانوی** ایک ہزار برس تک دنیا میں قائم رہا اور باوجودیکہ روم کی مسیحی۔ شہنشاہی اور **پطرس** کے جانشین **پاپاؤں** نے اس پر بڑے بڑے اور طرح طرح کے ظلم کئے مگر کسی طرح اُن کے مٹائے نہ مٹ سکا۔ فتوحات **اسلام** سے بھی اس مذہب کو بڑا ضرر پہنچا تھا۔ لیکن عربی حکومت میں بھی ایک مدت دراز تک زندہ رہا۔ لیکن آخر **مسلمانوں** ہی کی کوشش سے غالباً اس مذہب کا خاتمہ ہو گیا

کتاب ملل و نحل میں علامۂ شہرستانی نے۔ **مانی** کے باپ کا نام **فاتر** بتایا ہے۔

جالینوس

یونان کے جو طبیب فن طب کے موجد اور اصلی معلم تسلیم کئے گئے ہیں وہ آٹھ بتائے جاتے ہیں۔ جن میں سے جالینوس سب سے آخری اور سب معلمین تو ان میں سے اکثروں سے بڑا اور گران پایہ ہے مگر اس سبب کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اس کے بعد یونانیوں میں سے کوئی طبیب اور حکیم اس کے

مرتبہ کو نہیں پہنچ سکا۔ گو وہ یونانیوں میں خیال کیا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت اُسکا شمار مشکل سے یونانیوں میں کیا جاسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک یونانی خاندان ہی کا چشم وچراغ تھا۔ مگر باعتبار زمانہ اُس وقت میں پیدا ہوا جب کہ ترقی یونان کا ستارہ غروب ہوچکا تھا۔ یعنی رومیوں کی عظمت و سطوت نے یونان کی حکومت ہی کو نہیں بلکہ اُس کے علم وفضل کو بھی پامال کردیا تھا۔ اور باعتبار وطن ایشائے کوچک کے شہر سمرنا کے قریب پیدا ہوا تھا۔ جو آج دولت عثمانیہ کا ایک ایشیائی بندرگاہ ہے۔ اور جس کے لحاظ سے بمقابل یورپ والوں کے اہل ایشیا کو اُس پر ناز کرنے کا زیادہ حق حاصل ہے

حضرت مسیح کے بعد جب طیطوس (ٹائٹس) قیصر نے ارض مقدس کو پامال کرکے خاص ہیکل سلیمانی میں آگ لگائی ہے۔ اور یہود کا کلیتہً قلع وقمع کردیا ہے اُن دنوں ایشیائے کوچک میں ایک یونانی الاصل مہندس رہتا تھا جسے علوم ہندسہ وریاضی میں بے انتہا دستگاہ تھی۔ ہیأت۔ حساب۔ مساحت اور منطق میں اعلےٰ درجہ کی لیاقت رکھتا تھا۔ فلسفہ کا اُسے ذوق تھا۔ اور اہل شہر اُس کی راستبازی۔ وفاکیشی۔ نیک نفسی وپاکبازی کے معترف تھے اُس کا باپ ایک زبردست مہندس تھا۔ جس نے علم کو عملی حیثیت سے بھی تکمیل کو پہنچایا تھا۔ اور ایک زمانے میں سب سے بڑا مستری اور بڑھیون کا سردار رہا تھا۔ اور اُسکا دادا علم مساحت میں کامل مانا گیا تھا۔ غرض علم وفضل اور خاصکر علوم ریاضی اُس کے خاندان میں چلے آتے تھے۔ مگر اس ذاتی علم اور خاندانی فضیلت کے ساتھ اپنی زندگی کاشتکاری میں بسر کرتا تھا۔ اور اس میں بھی اُس نے اپنی ذاتی لیاقتوں کے باعث ایک معزز زمیندار کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ اسی خوش نصیب شخص کو یہ عزت

حاصل ہے۔ کہ خدا نے اُسے جالینوس کا ایسا نامور بیٹا عطا کیا جو فخر خاندان ہی نہیں بلکہ فخر عالم اور فخر زمانہ ہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے دنیا کا سرمایۂ ناز ہے۔

جالینوس کا نام عربی میں آگے زیادہ بگڑ گیا۔ انگریزی تلفظ کے موافق اُس کا نام گے لی۔ نس کلاڈیس ہے مگر یونانی اور رومی زبانوں میں اُسکا صحیح تلفظ گالے نوس قلو دیوس ہونا چاہیئے۔ نام کا دوسرا لفظ تو عربوں نے غالباً غیر مانوس ہونے کی وجہ سے مطلقاً چھوڑ دیا۔ پہلے لفظ کو موجودہ اُصول کے موافق اگر صحیح طور پر معرب کیا جاتا تو غالے نوس ہوتا۔ مگر قدمائے عرب کا یہ قاعدہ نہ تھا۔ وہ ہمیشہ "گ" کو "ج" سے بدلا کرتے تھے۔ اور اسی قاعدے کے مطابق انہوں نے گالے نوس کو جالینوس بنا دیا۔ اس لفظ کے معنے یونانی زبان میں "ہدایت کرنے والے" اور رُہبر کے ہیں بعض علمائے عرب نے اس کے معنے فاضل کے بتائے ہیں مگر صحیح پہلا ہی خیال ہے۔

جالینوس کی ولادت ایشائے کوچک کے ایک مغربی شہر میں ہوئی جو قسطنطنیہ سے مشرق وجنوب جانب فی الحال اناطولیا کے علاقے میں ہے۔ اُس شہر کا نام اہل عرب فرغامس بتاتے ہیں۔ اور انگریزی مورخین کے نزدیک "پرگاموس" ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے بعض قدما کے حوالے سے لکھ دیا ہے۔ کہ شہر فرغامس وہی شہر ہے۔ جسکو "سمرنا" کہتے ہیں۔ سمرنا آجکل ایک بہت مشہور ہے۔ اور دولت عثمانیہ کا ایک بہت بڑا ایشائی بندرگاہ ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اسی شہر کا نام اُن دنوں فرغامس تھا۔ سمرنا سے تقریباً ۳۰ یا ۳۵ میل کے فاصلے پر رومیوں اور

یونانیوں کے زمانے میں "پرگامم" نام ایک بڑا شہر موجود تھا جو آجکل بھی ہے اور اب "پرگاموں" کہلاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی وہ شہر گاموں ہے جس کو جالینوس کا وطن ہونے کی عزت حاصل ہے۔

ہارون رشید کے مشہور طبیب دربار جبرئیل بن بختیشوع کا بیان ہے۔ کہ جب ہارون رشید نے رومیوں کے ملک پر حملہ کیا اور بڑھتے بڑھتے جا کے شہر قرہ میں ٹھہرا تو میں نے عرض کیا کہ "ہمارے استاد فن جالینوس کا وطن یہاں سے دو ہی فرسخ ہے۔ اجازت ہو تو میں جا کے زیارت کر آؤں اور اُس کے مکان کی جگہ پر بیٹھ کے کچھ کھاؤں پیوں تاکہ اپنے معاصر طبیبوں پر جتنے اس بات پر فخر کرنے کا موقع مل جائے کہ میں نے خاص جالینوس کے گھر میں بیٹھ کے کھایا پیا ہے" رشید نے کہا "دشمن کا ملک ہے۔ اور رومی سپاہی آس پاس لگے ہوئے ہیں۔ تم کو پکڑ لے جائیں تو کیا کرو گے" میں نے عرض کیا "سطوت خلافت ایسی نہیں کہ کسی کو پاس پھٹکنے کی بھی جرات ہوسکے۔ بھلا رومیوں کی مجال ہے۔ کہ مجھ پر ہاتھ ڈالیں" رشید بولا "تاہم احتیاط شرط ہے" اور حکم دیا کہ پانچ سو سوار میرے ہمراہ جائیں میں نے گھبرا کے کہا۔ "پچاس آدمی کافی ہیں" اس پر رشید ہنسا اور کہا میں سمجھا۔ ڈرتے ہو۔ کہ اتنے لوگوں کو کھلانا پڑے گا؟ اچھا تو اب تمہارے ساتھ ایک ہزار جوان جائیں" اب میں نے مایوسی کے لہجے میں افسردہ ہو کے کہا "معلوم ہوتا ہے۔ جالینوس کے وطن کی زیارت میری قسمت میں نہیں ہے۔ حضور میں جانے ہی سے باز آیا" اس پر رشید اور زیادہ ہنسا۔ اور اپنے باپ مہدی کی قسم کھا کے کہا "تم جاؤ گے اور ہزار جوان تمہارے ہمراہ ہونگے۔ غرض جبرئیل جبراً و قہراً اسی شاہی جلوس کے ساتھ

گیا۔ جالینوس کے مکان کا پتہ لگایا۔ اور اُس میں بیٹھ کے کھانا کھایا جبریل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ باوجودیکہ تقریبًا سات سو برس گزر گئے تھے۔ مگر اُس وقت تک وہان جالینوس کے مکان کے کھنڈر موجود تھے جنکی حالت و وسعت بتارہی تھی کہ کسی زمانے میں بڑی شان و شوکت کا نمونہ ہون گے۔

جالینوس کے سنہ ولادت میں بھی بڑا اختلاف ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ جالینوس نے اپنی کتابون میں اپنے دور۔ اپنے زمانے اپنی عمر اور اپنے عہد کے فرمارواؤں کے حالات نہایت ہی توضیح سے بتائے ہیں تو اس اختلاف پہ سبسے انتہا حیرت ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ابتدا کا تبوں اور ناسخوں سے بعض غلطیان ہوگئیں جن کی وجہ سے سنین کے حسابات میں فرق پڑنے لگا۔ اور مورخین عرب نے جو اختلاف روایات کے نقل کرنے میں بڑے مشاق ہیں۔ اس کی بنیاد پہ ایسی ایسی پیچیدگیان پیدا کیں کہ جالینوس کسی کے نزدیک تو حضرت مسیح کا معاصر تھا۔ کسی کے خیال میں پچاس ساٹھ برس بعد۔ اور کسی کے نزدیک دو ڈھائی سو برس بعد۔ غور کرنے سے صحیح یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تقریبًا ۱۳۰ء میں وہ پیدا ہوا۔

یحییٰ نحوی نے جس طرح دیگر حکمائے یونان کی عمرون کو مختلف مشاغل میں تقسیم کر کے بتایا ہے۔ اُسی طرح جالینوس کی نسبت بھی لکھ دیا کہ ۸۷ برس زندہ رہا۔ جس میں سے ۱۷ سال بچپن اور طالب علمی میں صرف ہوئے۔ اور ۷۰ برس تک ایک گران پایہ عالم و فاضل اور مرجع زنام رہا۔ مگر ایسی باتوں میں بجاتے۔ تاریخی اعتبار سے کہانی کی شان

ہوتی ہے۔ اس تقسیم کی تردید خود جالینوس کے بیان سے ہوتی ہے اس لئے کہ وہ لکھتا ہے۔ کہ سترھویں برس میرے والد نے مجھے طب کی تعلیم دلانی شروع کی اور اسی وجہ سے علامہ ابن ابی اصیبعہ نے بھی یحیٰی نحوی پر اعتراض کیا ہے۔

جالینوس چونکہ ایک شریف اور صاحب علم گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ لہذا باپ کو اس کی تعلیم کی بے انتہا فکر تھی۔ اور یہ خیال زندگی کے تمام خیالات سے زیادہ اس کے دل میں جاگزین تھا۔ وہ ہونہار بیٹے کے اُستادوں اور معلموں پر اپنا روپیہ صرف کرتا تھا۔ بلاد دور و دراز سے لائق و مشہور لوگون کو بلاتا تھا اور بیٹے کو ان کی تربیت میں دیتا تھا۔ مگر چونکہ خدا کو منظور تھا کہ باپ کی یہ توجہ اور محنت بار در ہو لہذا بیٹے کے دل میں بھی علم کا شوق ڈال دیا۔ اور وہ علم کیطرف اس ذوق و شوق سے دوڑتا تھا۔ جیسے پروانہ شمع کی طرف یا پیاسا پانی کیطرف دوڑتا ہے اُستاد سے سبق لینے کے بعد گھر آتا تھا۔ تو کسی چیز کی طرف نظر نہ دوڑاتا بلکہ راستے بھر اپنا سبق یاد کرتا آتا۔ چنانچہ معمول تھا۔ کہ گھر پہنچتے پہنچتے اُسے سبق یاد ہو جاتا۔ ساتھ والے اور ہم سبق اُس کی ان باتوں کو دیکھ کے حیران رہ جاتے تھے۔

ابتداً باپ نے اُسے انہیں علوم کی تعلیم دلانی شروع کی جو اُس کے خاندانی علوم تھے۔ یعنی ہندسہ۔ حساب۔ ریاضی وغیرہ۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ کہ اپنے سن صبا میں میں نے علم برہان کی تعلیم پائی۔ جس کے لئے بعض اوقات اُسکے باپ کے دست شفقت سے مار بھی کھائی۔ اور اسی ذاتی شوق اور قابلیت فطری کی برکت تھی کہ پندرھویں ہی برس ان سب سے فراغت حاصل کر کے اُس نے علم منطق شروع کر دیا تاکہ علوم فلسفہ کی طرف توجہ کر سکے اس مشغلہ میں جوان دونوں نہایت ہی متبرک اور مذہبی مشغلہ خیال کیا جاتا تھا۔ دو ہی سال مشغول رہنے پایا تھا۔ کہ اُس کے باپ نے اتفاقاً کوئی خواب دیکھا جس نے اُس سن رسیدہ

یونانی جہندس پر کچھہ ایسا اثر پیدا کیا کہ اُس نے بیٹے کی تعلیم کے متعلق اُس کے اغراض و مذاق میں ایک نمایاں انقلاب پیدا ہو گیا یا تو منطق و فلسفہ پڑھا رہا تھا یا بیٹے کو طب کی تعلیم دلانی شروع کی۔ اور جس وقت سے جالینوس نے فن طب کی طرف توجہ شروع کی ہے۔ اُس وقت اُس کی عمر سترہ برس کی تھی۔ مگر اس فن میں اُسے کچھہ ایسا مزہ ملا یا علوم روحانی و فلسفہ کیطرح علم طب نے اُس پر بے وقعتی عالم کا ایک ایسا خاص اثر ڈالا کہ اس نے اس کم سنی و عنفوان شباب کے زمانے ہی میں لذائذ دنیوی کو یک قلم چھوڑ دیا۔ اور لوگوں کے دلوں میں جن چیزوں کی ہوس ہوا کرتی ہے۔ اُن سب کو ذلیل اور اپنی شان سے ادنے خیال کرنے لگا۔ اُف اُس نے یہاں تک فروتنی اختیار کی کہ اپنے آپ کو نہایت ہی ذلیل درجے پر دکھاتا تھا۔ رات رات بھر جاگتا اور اُن علمی خزانوں کی فکر میں رہتا جو حکماء و اطبائے قدیم کے ورثہ اور ترکہ تھے۔

چونکہ وہ ایک بیمثل و بے ہمتا طبیب تھا لہٰذا اپنی زندگی کو بھی اُس نے طبی حیثیت سے اور صحت و مرض کے لحاظ سے بتایا ہے۔ چنانچہ اُسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب اُسکا عنفوان شباب تھا۔ اور لذائذ دنیوی سے وہ بہت کچھہ احتراز کرنے لگا تھا۔ اُس کے والد نے اُسے تو تعلیم پانے کے لئے شہر میں چھوڑ دیا اور خود اس قریب کے گاؤں میں جا کے اقامت پذیر ہوگئے جہاں اُن کی زمینداری اور کھیتی تھی باپ سے جدا ہونے کے زمانے میں بعض ہم سنوں اور ہم سبقوں سے اُس سے صحبت پڑی۔ چونکہ ذاتی شوق اور نہ تھکانے والی محنت کے باعث وہ ہمیشہ ہم عمروں اور ہم سبقوں پر غالب رہتا تھا اور درس میں اُن سے آگے نکل جاتا تھا۔ لہٰذا یہ لازمی بات تھی کہ ہم سن زیادہ شوق سے بلکہ اپنا فخر سمجھ کے اُس سے ملا کرتے تھے۔

انہیں دوستوں میں کسی دن میوہ خوری کی صحبت ہوئی اور جالینوس اپنی عادت کے خلاف خوب پیٹ بھر کے اور تن کے کھا گیا۔ اُسوقت تو صحبت لطف و مذاق میں ٹل گئی مگر چند روز بعد جب موسم خریف شروع ہوا تو وہ بیمار ہو گیا۔ اور ایسا سخت بیمار کہ بغیر فصد کھولے جان بر نہ ہو سکا۔ اس بیماری کو وہ اپنی اُسی میوہ خوری کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ باپ کو خبر ہوئی تو بیتاب ہو کے دوڑا آیا۔ اُسے اس بد پرہیزی پر لعنت ملامت کی۔ ڈانٹا ڈپٹا۔ اور کہا بھلا تم خیال تو کرو کہ تمہارے بچپن میں غذاؤں کے متعلق کیسی کیسی احتیاطیں کی جاتی تھیں اور پرہیز کا کس قدر لحاظ رکھا جاتا تھا۔ خبردار پھر کبھی دوستوں میں بیٹھ کے ایسی بے احتیاطی نہ کرنا۔ غرض خدا خدا کر کے اس بیماری سے اچھا ہوا۔ اور غذاؤں کے متعلق پوری احتیاط کو عمل میں لانے لگا۔ اس پہلی بیماری کے وقت اسکی عمر ۱۹ سال کی تھی۔

اس واقعہ کو ایک ہی برس گزرا تھا۔ اور اُس کی عمر کا بیسواں سال تھا کہ شفیق باپ نے اس عالم فانی کو رخصت کیا۔ اور جالینوس کا وہ مہربان ہمدرد دنیا سے اٹھ گیا۔ جو اُس کی تمام فکروں کو اپنے سر لئے ہوئے تھا۔ اور جسکی وجہ سے اُسے کبھی کسی قسم کی فکر معاشرت سے سابقہ نہیں پڑنے پایا تھا جس کی پہلی مضرت یہی برداشت کرنی پڑی کہ دوستوں کو نا عاقبت اندیشی سے پھر ایک مرتبہ میوہ جات کے استعمال میں پہلی ہی سی بد پرہیزی کی۔ وہی پہلی سی بیماری پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پھر فصد لینی پڑی۔ مگر اَب کی مرتبہ کی بیماری نے زیادہ ستایا اگرچہ فصد لینے سے بیماری کا زور ٹوٹ گیا۔ مگر سلسلہ مرض کئی سال تک چلا گیا۔ اور عموماً یہ حالت تھی کہ کبھی بیمار ہو جاتا اور کبھی اچھا ہوتا۔ یہاں تک کہ ۲۸ برس کی عمر کو پہنچ گیا۔ اسی زمانے میں اُسے ایک بہت سخت مرض برداشت کرنا پڑا جس سے [illegible] کے بعد خدا نے اُسے نجات دی۔ یہ مرض

ایک پھوڑا تھا۔ جو جگر کے قریب نکلا تھا۔ اور ایسا سخت تھا۔ کہ اُس زمانے کے مذاق وعقائد کے مطابق اُس نے منت مانی تھی کہ اگر شفا حاصل ہوگئی تو اسقلیپیوس ہیکل یعنے مندر کی زیارت کروں گا۔ جو اسقلیپیوس کا مندر کہلاتا تھا۔ اور اسی منت کو اُس وقت پورا کیا جب قیصر روم اُسے اپنے ساتھ میدان جنگ میں لے جانا چاہتا تھا۔ اور اُس نے اسی منت کا عذر پیش کرکے اپنی جان چھڑائی۔

اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ اسقلیپیوس جو یونان کا پہلا طبیب تھا اُسکے نام کا ایک مندر قیاصرۂ روم کے دور اور حضرت مسیح کے زمانے کے بعد تک موجود تھا۔ اور اُس کی زیارت اسقلیپیوس کے کمالات کے لحاظ سے موجب صحت خیال کی جاتی۔ اور مریض صحت پانے کے لئے اُس کی زیارت کرتے اور چڑھاؤں کی منت مانا کرتے تھے۔ وہ ہیکل اگرچہ بُت پرستی کا ایک کرشمہ ہوگی مگر پھر بھی ایک بڑے نامی گرامی اور گراں پایہ طبیب کی یادگار تھی۔ مگر افسوس کہ مسیحیت نے جس طرح یونان و روم کے قدیم علم و فضل کی اور تمام یادگاروں کو تہ و بالا کرکے دنیا سے مٹا دیا اُسی طرح اس ہیکل کو بھی فنا کر دیا۔

بہرتقدیر اس سخت بیماری کے بعد پھر جالینوس نے عہد کیا اور قسم کھائی کہ اب انجیر اور انگور کے سوا کسی پھل کو کبھی نہ کھاؤں گا۔ اور انجیر و انگور کو کھاؤنگا بھی تو بخوبی اندازہ کر کے اور خوب دیکھ بھال کے کہ وہ پکے ہیں اور خراب نہیں ہوئے ہیں اُس کے ساتھ اُس کے تمام دوستوں اور ہم عمروں نے بھی یہی قسم کھائی۔ جسکا فائدہ بھی وہ یہ بتاتا ہے۔ کہ میں پھر کبھی بیمار نہیں ہوا۔

عمر کے اٹھائیسویں برس اس مرض شدید میں مبتلا ہوا تھا۔ اور غالباً اب وہ فن طب میں بھی اپنی تعلیم کو پورا کر چکا تھا۔ کیونکہ اُس کے دو ہی سال بعد اپنی عمر کے تیسویں برس ایک معزز و محترم طبیب کی حیثیت سے وہ شہر

روستہ الکبریٰ میں پہنچا۔ روما کا ان دنوں زمانۂ عروج تھا۔ قیصروں کی عظمت و جبروت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اور جس طرح سوا ایران کے مغربی ایشا اور سارے یورپ وافریقہ کے تمام ممالک سلاطین روما کے آگے سر اطاعت جھکائے ہوئے تھے۔ اسی طرح ساری دنیا کے کل علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا مرجع بھی روستہ الکبریٰ ہی تھا۔ وہاں بڑے بڑے علماو فضلا۔ ایک سے ایک بڑھ کے کامل فن۔ روشن خیال فلسفی۔ اور حاذق طبیب جمع تھے۔ جن کے مقابل میں کسی نئے شخص کا آ کے کسی فن میں دعویٰ کرنا۔ اور شہرت و ناموری حاصل کرنا اور خصوصاً ایسے شخص کا جو نوعمر و نوخیز ہو نہایت دشوار بلکہ غیر ممکن کے درجے کے قریب پہنچا ہوا تھا۔ مگر جالینوس ہی تھا جس نے وہاں پہنچنے کے چند ہی روز بعد سب کو دبا لیا۔ اور ایسی شہرت حاصل کی کہ دہی وہ تھا۔

جس وقت وہ روستہ الکبریٰ میں پہنچا ہے۔ مرقوس اوریلیوس انطونی نوس قیصر کا ابتدائی دور تھا۔ اس لئے کہ وہ سنہ ۱۶۱ع میں تخت نشیں ہوا تھا۔ چونکہ جالینوس تقریباً سنہ ۱۳۰ع میں پیدا ہوا تھا۔ اور عمر کے تینتیسویں برس یہاں آیا۔ جس حساب سے اس کے ورود روما کا سال سنہ ۱۶۳ع قرار پاتا ہے۔ یہ کمی شاید مہینوں کی کمی زیادتی سے پوری کی جا سکے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ جس وقت وہ پہنچا ہوگا موجودہ قیصر کی تخت نشینی کا پہلا ہی سال اور بالکل ابتدائی زمانہ ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ورود روما کے ابتدائی زمانے ہی میں اس نے ایک مرتبہ کسی رومی افسر کے سامنے مقدس اطبائے روم کو جمع کیا۔ پھر ایک جانور کو منگوا کے اس کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ آنتیں وغیرہ باہر نکالیں۔ اور سب سے کہا جس طرح یہ سب اعضا تے اندرونی پیٹ کے اندر تھے انھیں آپ پھر اندر رکھ دیجئے۔ ان سب کے لئے یہ ایک ایسا نیا کام تھا۔ کہ کسی کو ہاتھ ڈالنے کی

جرأت نہ ہوئی اور جب سب عاجز ہو گئے۔ تو اُس نے سب کے سامنے وہ آنتیں وغیرہ حسب سابق مُرتب کر کے رکھ دیں۔ اس کے بعد اس نے ایک اور زندہ جانور منگوا کے اُس کی چند رگیں کاٹ دین۔ اور جب اُن سے خون کے فوارے جاری ہوئے تو اطبائے حاضرین سے کہا۔ اسکا علاج کیجئے۔ یہ خون رُک جائے اور رگین جڑ جائیں۔ مگر اب بھی کسی سے کوئی تدبیر نہ بن پڑی۔ تب اس بارے میں بھی اُس نے اپنا یہ کمال دکھایا کہ ان لوگون کے سامنے ہی خون روک دیا اور رگیں جوڑ دیں۔

یہ واقعہ حاضرین پر غیر معمولی اثر ڈالنے اور انھیں معتقد بنا دینے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ اُسی افسر نے جسکے سامنے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اپنے ایک فوجی شفاخانے پر اُسے مقرر کر دیا۔ جالینوس نے اس دار الشفا میں ایسی توجہ و ہوشیاری سے کام کیا کہ اوّل تو تین سن رسیدہ اور تجربہ کار طبیبوں کا بار اپنے سر اٹھا لیا۔ اور اس کامیابی سے علاج کیا۔ کہ پیشتر والے اطبا کی نگرانی میں ۱۶ آدمی مرے تھے اور جالینوس کی نگرانی کے وقت اتنی ہی تعداد میں سے صرف دو آدمی مرے باقی سب اچھے ہو گئے اس کامیابی کی شہرت ہوئی تو ایک اُس سے بھی بڑے فوجی سردار نے ایک بڑے شفاخانے کا کام اُس کے سپرد کر دیا۔ یہاں جالینوس نے اُس پہلے شفاخانے سے بھی زیادہ مستعدی دکھا کے کامیابی حاصل کی۔ یعنے باوجودیکہ لوگ بہت شدید زخمی تھے۔ اور متعدد کاری زخمون کے گھائل تھے۔ مگر اُسکی غیر معمولی توجہ سے سب جان بر ہو گئے۔

انھیں چیزوں نے اُسے اس قدر مشہور کر دیا کہ قیصر روم انطونی نوس کے دربار تک باریابی کی عزت حاصل ہوئی۔ اور بوائثیوس نام ایک عالی مرتبہ رومی امیر کے لئے جو خاص رومۃ الکبریٰ کا حاکم تھا۔ علم تشریح میں ایک کتاب لکھی۔

اور روز بروز شہرت و ناموری ہی حاصل کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اب روما میں اُس کے مقابل کا کوئی طبیب نہیں تسلیم کیا جاتا تھا۔ روم میں اُس کی ناموری و شہرت کا ایک یہ ذریعہ بھی تھا۔ کہ وہ مجمع عام میں علم تشریح پر لکچر دیا کرتا تھا جس سے سب لوگ اس کے علم و فضل کے نہایت ہی معترف ہو گئے تھے۔ حتے کہ خود بادشاہ نے اپنی غیبت میں اپنے بیٹے کی صحت کا نگراں اور اسکا معالج اسی کو مقرر کیا۔

ایسی ناموری ایسی مقبولیت۔ ایسی عزت۔ اور اس درجے کا تجربہ حاصل ہونے کے بعد اُس نے غور سے دیکھا تو اُن دنوں اطبائے سوفسطائی کا زور و شور تھا جو محض اوہام اور مغالطوں میں مبتلا تھے۔ اور فن طب کو روز بروز غارت کرتے جاتے تھے۔ یہ چیز اُسے سخت ناگوار ہوئی اور خیال کیا کہ فن طب کو زمانے کی اس دست برد سے بچانا میرا سب سے بڑا اور اہم فرض ہے۔ اس بات کا خیال آتے ہی وہ اطبائے زمانہ کی مخالفت پر اٹھ کھڑا ہوا۔ صرف بقراط اور اُس کے پیرووں کے اصول کو اختیار کر لیا۔ اُن کی تائید و تقویت کی۔ اور جو لوگ اُس قدیم صحیح ڈھرے سے ہٹ گئے تھے۔ اُن کو ملزم ٹھہرایا۔ اور انکی غلطیاں پکڑنی شروع کیں۔ اسکا لازمی نتیجہ تھا کہ اطبائے زمانہ سے مخالفت بڑھی۔ جھگڑے پیدا ہوئے۔ اور بارہا مناظرے اور ردّ و قدح کی نوبت آئی۔ جن میں مقبولیت اور تجربہ نے ہمیشہ جالینوس ہی کو کامیاب کیا۔

رومتہ الکبریٰ میں یہ تمام کمالات اُس نے چند ہی روز میں دکھا دیئے۔ اور وہاں صرف تین سال کے قیام نے اُسے نہایت ہی شہرت و عروج کے درجے پر پہنچا دیا۔ اس لئے کہ اپنی عمر کے تیسویں سال روما میں گیا تھا اور تینتیسویں[۳۳] برس واپس چلا آیا۔ اور ارادہ تھا کہ وطن میں بیٹھ کے اہل وطن کی خدمت کرے یا دیگر ممالک میں سفر کر کے اپنے علم و فن میں زیادہ کمال حاصل کرے۔

شہر ردمتہ الکبریٰ کے اس پہلے قیام ہی کے زمانے میں اُس نے پوری شہرت و ناموری حاصل کرلی تھی۔ ایسی شہرت کہ ردمہ کا کوئی طبیب اُسکے مقابل میں نہ ٹھہر سکتا تھا۔ منجملہ اُن شفاخانوں کے جن کا پہلے ذکر آچکا ہے اُس نے مذہبی دار الشفاء میں بھی اپنے کمالات دکھائے تھے۔ وہاں کوئی بہت بڑا مندر تھا جو مذہبی حیثیت سے مرجع عالم بنا ہوا تھا۔ وہاں کے سب سے بڑے پوجاری نے جو تمام اہل ردم کا مقتدا اور پیشوا تھا۔ اُس کی قدر کی۔ اور اسی مندر کے متعلق جو زبردست شفاخانہ تھا اس کی نگرانی اور اُس کے مریضوں کا علاج اُس نے جالینوس کے ذمے کیا یہاں اُس طبیب بے ہمتا نے طبی کمالات کے ساتھ جوش عقیدت سے بھی کام لیا۔ اور ایسی توجہ و سرگرمی ظاہر کی کہ لوگ کہتے ہیں ردمہ میں اُس کی شہرت و ناموری کا ذریعہ یہی شفاخانہ ہوا۔

اپنی کتاب تشریح میں اُس نے جو حالات خود بیان کئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ردمتہ الکبریٰ میں تین سال رہ کے بہت سے ارادے اور آرزوئیں دل میں لئے ہوئے وہ واپس تو چلا آیا مگر شاید چند روز بھی اطمینان سے بیٹھنا نہیں نصیب ہوا۔ اُن دنوں ردم کے دو قیصر رہا کرتے تھے جو دونوں اتفاق سے کسی مہم کے سر کرنے کے لئے شہر اقولیا میں آکے فروکش ہوئے جالینوس کے کمالات کے وہ پیشتر سے معترف ہو چکے تھے۔ اور انکی نظر میں اس سے بڑا کوئی طبیب نہ تھا۔ لہٰذا فوراً شاہی فرمان اُسکی طلبی میں پہنچا۔ جالینوس چونکہ محنت سے تھک کے آیا تھا۔ اور دیگر ممالک میں سفر کرکے تجربات طبی میں ترقی کرنے کا دلدادہ ہو رہا تھا۔ لہٰذا اب قیاصرہ کے دربار سے بھاگتا تھا مگر حکم حاکم مرگ مفاجات۔ عذر کرنا بے سود تھا۔ طوعاً و کرہاً اقولیا کی راہ لی اور حاضر دربار ہو گیا۔ لیکن اب بھی اُسے دل میں اُمید تھی۔ کہ ان دونوں

قیصرون مین سے ایک رحمدل اور قدردان ہے۔ اگر اُسکے سامنے عذر خواہی کیجائیگی تو واپسی کی اجازت ملجائیگی۔ اتفاق کی بات جالینوس اقولیا مین پہنچا ہی تھا کہ وبا شروع ہو گئی۔ اور لوگ بیمار ہو ہو کے مرنے لگے۔ خود اُسکا بیان ہے کہ یہ وبا ایسی شدید تھی کہ اس سے پیشتر کبھی نہین سُنی گئی تھی۔ دونون قیصرون نے تو بے تحاشا بھاگ کے رومتہ الکبریٰ کی راہ لی۔ اور لشکر اقولیا ہی مین پڑا رہا۔ مگر موت گویا ان قیصرون کے پیچھے بھی دوڑتی چلی آتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونون مین سے ایک راستہ ہی مین بیمار پڑ کے مر گیا۔ اور دوسرا اُسکی لاش کو لئے ہوئے رومہ مین پہنچا۔ جہان اپنے شریک سلطنت کی خاک کو خاک رومہ کے سپرد کر کے اُسے اطمینان نصیب ہوا۔ مگر رومہ مین چند ہی روز ٹھہرنے کے بعد اُسنے ایک مہم پر روانہ ہونیکی تیاریان کر دین۔

جالینوس اس پورے سفر مین اُسکے ہمراہ رکاب تھا۔ اور واقعات ایسے پیش آتے گئے کہ اُسے واپسی کی اجازت حاصل کرنے کا موقع ہی نہین ملا۔ اب قیصر روم ایک عظیم الشان مہم پر اور معرکہ آرائی کے ارادے سے جانے لگا تو جالینوس کو بھی ہمراہ رہنے کا حکم دیا۔ اور اس بات کی استمالت شروع کی کہ وہ میدان جنگ مین جا کے شاہی طبیب کی خدمت بجا لائے۔ جالینوس نے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہین یہ عذر پیش کیا کہ مجھے اپنی یہ منت پوری کرنی ہے کہ اسقلیبیوس کے مندر کی زیارت کرون۔ اور وہان کے رسوم زیارت کو بجا لاؤن۔ قیصر نے جب دیکھا کہ جالینوس اس نازک سفر مین ساتھ نہین دیتا تو کہا اچھا تم ساتھ نہ چلو۔ اور تمھین اجازت ہے کہ اپنی منت بھی پوری کرو۔ مگر وطن واپس جانیکی اجازت نہین دیجا سکتی۔ تا وقتیکہ مین رومہ مین واپس نہ آجاؤن تم ہمارے دار السلطنت ہی مین ٹھہرے رہنا۔ اور اگر مین نہین تو میری غیبت مین میرے بیٹے کے معالج رہنا۔ الغرض یہ حکم دے کے قیصر انطنیوس لڑائی پر چلا گیا۔ اور جالینوس

کے پاؤن مین بدستور بیڑیان پڑی رہین ۔

اب اُسکی شہرت اِس درجے کو پہنچی ہوئی تھی کہ لوگ اُس کے نام سے ناجائز تمتع حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ چنانچہ ایکدن وہ روم کی سڑک پر چلا جاتا تھا کہ دیکھا ایک مقام پر غیر معمولی بھیڑ لگی ہوئی ہے ۔ اور لوگ کسی بیرونی شخص کو گھیرے کھڑے ہین ۔ جالینوس اِس تجسس مین کہ یہ کیا معاملہ ہے بھیڑ کے اندر گھسا اور اُس شخص کے قریب پہنچ کے اسکی باتین سُننے لگا ۔ وہ کہہ رہا تھا "مین ملک شام کے شہر حلب کا رہنے والا ہون ۔ اور جالینوس کا شاگرد ہون ۔ مجھے یہ ایک مجرب دوا اُس سے خاص طور پر ملی ہے جو اکسیر کا حکم رکھتی ہے" ۔ یہ کہہ کے وہ تو خاموش ہو گیا ۔ مگر جالینوس آنکھین پھاڑ پھاڑ کے اسکی صورت دیکھنے لگا کہ یہ کون شخص ہے ۔ اور اس سے کبھی کی شناسائی بھی ہے یا نہین ۔ ہزار غور کیا اور حافظے پہ زور ڈالا مگر کچھ یاد نہ آیا ۔ تب وہ کھڑا ہو کے اُسکے علاج اور اُسکے تدابیر دفع مرض کو غور سے دیکھنے اور سُننے لگا ۔ چند ہی لمحون مین معلوم ہو گیا کہ وہ محض ایک دغاباز شخص ہے ۔ اور شاگرد ہونا کیسا فن طب سے مس بھی نہین رکھتا تو آگے بڑھا اور لوگون سے کہا "یہ شخص بالکل جھوٹا اور جعلساز و مکار ہے ۔ مین خود جالینوس ہون ۔ اور کبھی اسکی صورت بھی نہین دیکھی ہے" ۔ اتنا سنتے ہی لوگ اُس پر جھپٹ پڑے اور گرفتار کر لیا ۔ اسکے بعد جب وہ جعلسازی کے جرم کا مرتکب قرار دئے کے دربار شاہی مین پیش کیا گیا تو اُسے سزا دی گئی ۔

اس قسم کے جعلساز ہر زمانے مین اور ہر فن کے مدعیون مین پیدا ہوتے رہے ہین ۔ مُسلمانون کے دور اولین مین جب فن حدیث ترقی کر رہا ۔ اور تنقید و تحقیق کی سرگرمیون نے امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کے سے باکمال نقادِ فن اور محدث پیدا کر دیئے تھے تو ایکدن کا واقعہ ہے کہ بصرہ کی جامع مسجد

مین یہ دونون بزرگ نماز سے فراغت کرکے اوراد و وظائف مین مشغول تھے کہ ناگہان ایک شخص آیا جس نے نماز پڑہی - اور کُل حاضرین مسجد کی طرف مخاطب ہو کے بآواز بلند کہنے لگا ”حدثنا یحییٰ ابن معین و احمد بن حنبل عن فلان عن فلان قال قال رسول اللہ الخ“ یعنے مجھ سے یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل نے فلان فلان لوگون کے سلسلے سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جو شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے اُس سے ایک چڑیا پیدا ہوتی ہے اُسکی چونچ ایسی ہوتی ہے اور پر لتنے ہوتے ہین ؛ اور ہر پر سے فرشتے وابستہ ہوتے ہین - خلاصہ یہ کہ اُس نے ایک بہت بڑی حدیث کئی ورقون کی کہانی کی شان سے بیان کر ڈالی - خود یہ دونون بزرگ جن سے وہ روایت کرتا تھا حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے - آخر دونون نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ تم نے اس حدیث کی روایت کی ہے - اور دونون نے کانون پر ہاتھ رکھا تب یحییٰ بن معین نے اُس شخص کو اشارے سے اپنے پاس بُلایا - اور پوچھا ”تم سے یہ حدیث کس نے بیان کی ؟“ جواب ملا ”یحییٰ ابن معین اور احمد بن حنبل نے“ اس شخص نے ان دونون ائمۂ حدیث کے صرف نام سُنے تھے پہچانتا نہ تھا - اُسکا یہ جواب سُن کے یحییٰ ابن معین نے کہا ”میں یحییٰ ہون اور یہ احمد بن حنبل ہین - مگر ہم دونون نے تو اس حدیث کو کبھی نہین سُنا - تمہین اس حدیث کی روایت کیونکر پہنچ گئی ؟“ مگر سچ یہ ہے کہ یہ عربی مکار اُس حلبی مکار سے جس سے جالینوس کو سابقہ پڑا تھا زیادہ جری اور چالاک تھا - وہ تو لاجواب ہو کے دوسری عدالت سے سزایاب ہوا - مگر اس نے اس تفضیح کی پروا بھی نہ کی - بلکہ یحییٰ بن معین کی زبان سے یہ کلمات سنتے ہی قہقہہ مار کے ہنسا - اور نہایت ڈھٹائی سے بولا ”مین سُنا کرتا تھا کہ یحییٰ بن معین بے وقوف ہین - آج اس کا تجربہ ہو گیا

آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ دنیا مین اکیلے آپ ہی یحییٰ بن معین ہین - اور یہی احمد بن حنبل ہین ؟ ممکن ہے کہ مین نے کسی اور یحییٰ بن معین اور دوسرے احمد بن حنبل سے روایت کی ہو" اس جواب پر بیچارے یحییٰ بن معین تو اسکا مُنہ دیکھ کے رہ گئے اور وہ ہنستا ہوا جامع مسجد سے نکل کے چلا گیا -

جالینوس جب دوسری مرتبہ شہر رومہ مین داخل ہوا ہے اُسکی عمر ۳۷ برس کی تھی - مگر معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ وارد روم ہونے سے پہلے اپنے علمی شوق مین اُس نے دو بحری سفر کئے تھے - ایک مرتبہ تو قورنطوس (کارنتھ) مین گیا جہان اُس نے سُنا تھا کہ زمانۂ ماسبق کے ایک مشہور طبیب قونطس کا کوئی شاگرد وہان موجود ہے جس کا نام افیقانوس ہے - مزید طبی واقفیت حاصل کرنے اور اُسکے خاندانی کمالات سے بہرہ یاب ہونے کے لئے وہ کارنتھ مین گیا اور اُسکی شاگردی کی عزت حاصل کی -

اسی طرح یہ سُن کے قونطس اور نومیسیانوس کے کچھ تلامذہ اسکندریہ مین موجود ہین اُس نے ارض مصر کا سفر کیا - اُن لوگون سے مِل کے اور اُن کے خزانہ ہائے علمی سے طبی دولت حاصل کر کے اپنے وطن کو واپس آیا - اسی موقع پر اُس نے گھر مین بیٹھ کے آزادی کے ساتھ علم طب کی خدمت گزاری پر کمر باندہی تھی کہ قیصران روم نے اُسے اقولیا مین طلب کیا جس سلسلے مین اُسے دوبارہ رومۃ الکبریٰ کی صورت دیکھنی پڑی جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہین انہین سفرون کے سلسلے مین اُس نے قدیم دارالسلطنت روم شہر اثینیہ (اتھنز) کا بھی سفر کیا تھا اُسکے اساتذہ یون تو بہت ہین مگر اسکا اصلی اُستاد جس سے اُس نے علم طب کو تکمیل کے ساتھ حاصل کیا - ارمینس نام اُس عہد کا ایک مشہور طبیب اور اُن دونون قلو لبطرہ (کلیوپیٹرا) نام ایک باکمال عورت تھی جو عورتون کے

محض علاج مین مشہور تھی - طب کے اس مخصوص حصے کے حاصل کرنے کے لئے اُس نے اِس عورت کی بھی شاگردی کی -

اُسکے شوق علم اور تحقیق وتفتیش کا اس سے پتہ چل سکتا ہے کہ محض اتنی غرض کے لئے کہ بعض معدنی ادویہ کو اُنکے اصلی معدن مین دیکھے اور اُن کا تجربہ کرے - اُس نے جزیرۂ قبرس (سائپرس) کا سفر کیا - اِسی ضمن مین جزیرۂ ملتوس مین پہنچا - پھر ارض سام مین آیا - جو سرزمین کہ اپنی قدامت اور اپنے روحانی والہامی کمالات کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتی تھی - اس مُلک مین بھی اُس نے بہت سے طبی تجربات حاصل کئے - اور ارادہ تھا کہ سفر کرتا ہوا اپنے وطن کو واپس جائے - راستے مین شہر قرما مین پہنچا جو میڈیٹرین سی (بحیرۂ روم) کے سواحل پر تھا - یہان پہنچتے ہی ناسازی آب وہوا نے کچھ ایسا اثر کیا کہ بیمار ہوا - اور اسہال کی شدت ہوئی -

خود طبیب حاذق تھا - اور بعض طلبا بھی گرد وپیش موجود تھے سب نے علاج مین بہت زور لگایا - مگر کسی طرح افاقہ نہ ہوا - علاج کی بے اثری نے چند ہی روز مین یقین دلا دیا کہ یہ جانے والا مرض نہین بلکہ مرض موت ہے لوگ کہتے ہین کہ بعض لوگ معترض بھی ہوئے کہ بڑی بڑی سخت بیماریون کا علاج کیا اور اس کا علاج نہین ہوسکتا - اُن لوگون کا اطمینان کرنے کے لئے اُس نے ایک مٹکا منگواکے اُسمین پانی بھروایا - پھر ایک دوا اُسمین ڈلوا دی اور تھوڑی دیر بعد لوگون سے کہا "مٹکے کو توڑ ڈالو" وہ توڑا گیا تو دیکھا پانی منجمد ہوگیا تھا - جو بشکل قطع مین بستہ ہوکے رہ گیا - اور مٹکے کے ٹھیکرے ٹوٹ کے الگ گر گئے - لوگون نے اسپر حیرت ظاہر کی - اور اُس نے کہا "اسی دوا کو جسکا تم نے یہ اثر دیکھا بہت کچھ استعمال کرچکا ہون - مگر دست نہین رُکے" خلاصہ یہ کہ اسی شہر قرما مین جو

علاقۂ مصر مین ہے اُس نامی گرامی طبیب نے دنیا کو رخصت کیا۔ اور وہین پیوند زمین ہوا۔ بعض مورخین کا دعویٰ ہے کہ اُس نے شہر فرما مین نہین بلکہ جزیرۂ صقلیہ مین اس دُنیائے فانی کو رخصت کیا۔ اور وہین مدفون ہے۔

یونانی فن طب کو اکثر الزام دیا جاتا ہے کہ اُسمین بنیاد زیادہ تر قیاسات پر قائم کی گئی ہے۔ اور کلیات ورکنا تشخیص و علاج تک مین قیاسی و عقلی اسباب و علل سے کام لیا جاتا ہے۔ مگر اُسکے سب سے بڑے مجدد جالینوس کا دستور العمل اسکے خلاف تھا۔ اسکا معمول تھا کہ تقلید محض سے بھاگتا۔ اور بغیر تجربہ کے کوئی رائے نہین قائم کرتا۔ اپنے اِس طرز عمل کو اُس نے خود ہی بتایا ہے۔ مگر اس سے زیادہ کمال یہ تھا کہ تجربات کی کثرت نے اُسکے دماغ مین فن طب کے متعلق ایسی مکمل ابتہادی قوت پیدا کر دی تھی کہ کسی معاملے مین اگر قیاس سے کام لیتا تھی تو وہ بھی ویسا ہی صحیح ثابت ہوتا جیسا کہ تجربہ کو ثابت ہونا چاہیئے تھا۔

ایک شخص گر پڑا تھا۔ خارجی ادویہ کے استعمال سے چوٹ تو اچھی ہوگئی مگر ساتھ ہی یہ عجیب و غریب نتیجہ ہوا کہ آواز بند ہوگئی۔ ہزار کوشش کرتا مُنہ سے آواز نہ نکلتی۔ اطبا اُسکے علاج سے عاجز آ گئے۔ اور اُنکی سمجھ مین بھی نہ آتا تھا کہ گرنے اور آواز بند ہونے سے کیا علاقہ ہے۔ اُس سے جالینوس سے ملاقات ہوئی اور جالینوس نے حالات سنتے ہی اُس کو اُن اعضا کی تشریح بتائی جو آواز نکلنے کے آلات واقع ہوئے ہین۔ اور اُسکے ذہن نشین کر دیا کہ آواز کن حرکات سے اور کیونکر نکلتی ہے۔ اور اِسی سلسلے مین اُسے جالینوس نے یہ بھی بتا دیا کہ گرنے سے آواز کے بند ہونے کا نتیجہ کیونکر پیدا ہوا۔ یہ گفتگو سُن کے اُس نے اِسی کا علاج شروع کیا۔ اور چند ہی روز مین نظر آگیا کہ جو رائے جالینوس نے قائم کی تھی بالکل صحیح تھی۔

بالکل ایسا ہی حال ایک اور شخص کا ہوا۔ وہ گھوڑے سے گر پڑا تھا۔ اور بہت چوٹ آئی تھی۔ علاج کرنے سے چوٹ کا نام و نشان بھی نہین باقی رہا۔ مگر اُسکے سلسلے مین یہ نیا مرض اُٹھ کھڑا ہوا کہ دو انگلیون مین حس زائل ہو گئی۔ بڑے بڑے اطبا نے سر مارا۔ مگر کسی کے سمجھ مین نہ آیا کہ جسم کے مختلف مقامات کی چوٹ سے اُن دو انگلیون کی حس کیون سلب ہو گئی۔ سب طرف سے تھک کے اُس نے جالینوس کی طرف رجوع کیا۔ جالینوس نے اس سے پوچھا "تمھارے چوٹ کہان آئی تھی؟" کہا "پیٹھ مین دونون شانون کے درمیان"۔ جالینوس کہتا ہے کہ اِتنا جواب سُنتے ہی مین نے اصل مرض کا پتہ لگایا۔ میرے خیال مین آگیا کہ انگلیون مین جو پٹھے ہین اُنکی جڑ کو اور خاص اُس مقام پر جہان سے وہ اُگے ہین نقصان پہنچا ہے۔ وہی دوا جسے اور سب اطبا انگلیون مین لگا رہے تھے مین نے پیٹھ پر اور خاص اُس جگہ جہان اُس نے چوٹ بتائی تھی استعمال کرائی۔ اور خدا کی قدرت کہ انگلیان اچھی ہو گئین۔ اُنکی حس عود کر آئی۔ اور تمام دیکھنے والے متحیر ہو گئے۔ ایسے ہی اُسکے اور بھی بہت سے علاج ہمین معلوم ہوئے ہین جن سے اُسکی تجربہ کاری اور مہارت فن کیساتھ اُسکی جودت و ذکاوت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اپنی زندگی مین اُسے ایک بہت بڑا نقصان بھی برداشت کرنا پڑا جس سے زیادہ اہم اور دل بٹھا دینے والا صدمہ صاحبان علم کے لئے نہین ہو سکتا۔ اُس نے جتنی کتابین تصنیف کی تھین وہ باستثنائے چند سب روستہ الکبریٰ کے کتبخانے مین حفاظت سے رکھی گئی تھین۔ اس لئے کہ اُنکو اُس نے زیادہ تر اُمرا و سلاطین کی فرمائشون ہی پر تصنیف کیا تھا۔ بدقسمتی سے وہ رومہ ہی مین تھا کہ اُس عظیم الشان کتبخانے مین آگ لگ گئی۔ اور تمام دیگر علمی کارنامون کے ساتھ

اُسکے کُل تصانیف بھی جل کے خاک اور دنیا سے ناپید ہو گئے۔ افسوس کہ
اُس نے اپنی بعض باقی ماندہ کتابوں مین جن تصانیف کی فہرست بتائی ہے
وہ دنیا مین نہین ہین اور اُسکے سامنے ہی فنا ہو چکے تھے۔

جالینوس کے بعد غالباً روم وغیرہ مین بہت سے طبیب ہوئے
ہون مگر ظہور اسلام کے زمانہ تک پھر کسی کو وہ عروج و ناموری نہین حاصل
ہوئی جو اِسکو حاصل ہوئی تھی۔ اور اسی لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ وہ خاتم
الاطباء تھا۔ اور اُسکا سا کوئی باکمال اُسکے بعد یونان و روم کی خاک سے نہین پیدا
ہوا۔ یہانتک کہ حضرت سرور کائنات علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور اطبائے
اسلام کا دور دورہ شروع ہوا۔ گو اُنکے ابتدائی دور مین بھی زیادہ تر اطبا
مذہب مسیحی کے پیرو تھے۔ مگر اُنکا شمار اطبائے اسلام ہی مین کیا جانا چاہئے
کیونکہ اُنکو اور اُنکے کمالات کو مغرب کی مسیحی دنیا سے کوئی علاقہ نہ تھا۔

اَب جالینوس دنیا مین نہین ہے۔ اُسکے کمالات ہمیشہ زندہ رہین گے
جن کے ساتھ ہی ہمین اُس کا حُلیہ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ اس مشہور و معروف
نام والے کی تصویر ہمین نقاش و مصور کے قلم نے تو نہین دکھائی۔ مگر مورخین کے
قلم نے اُسکی صورت کا ایک مہذب خاکہ ہمارے پیش نظر کر دیا ہے کہ اُس کی
رنگت گندم گون ہے۔ خط و خال اچھے اور نازک ہین۔ شانے چوڑے چوڑے
ہین۔ ہتھیلیان لمبی چوڑی اور وسیع ہین۔ اور اُنگلیان لمبی لمبی ہین۔ بال اچھے
اور خوشنما ہین۔ چہرہ ہنس مکھ ہے۔ چلتا ہے تو بہت متوسط چال چلتا ہے
نہ بہت آہستہ اور نہ بہت تیز۔ جسکی وجہ سے وہ ایک عالمانہ وقار کی زندہ تصویر
بنا رہتا ہے۔ مگر جو میانہ روی چال ڈھال مین ہے گفتگو مین نہین ہے۔
اس لئے کہ باتین زیادہ کرتا ہے۔ کبھی شاذ و نادر ہی خاموش نظر آتا ہے۔ اور

گویا اعتراض و نکتہ چینی کرنے پر تلا رہتا ہے لباس میں عموماً صفائی و پاکیزگی کا اہتمام کرتا ہے اور اچھے کپڑے پہنتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہین بلکہ عطر اور خوشبو کا بھی بہت زیادہ شوقین ہے۔ اور جدھر سے گزر جاتا ہے خوشبو کی لپٹین آتی ہین۔ اور راستہ مہک اُٹھتا ہے۔ دو چیزون کا اُسے بے انتہا شوق ہے اور ان دونون کامون سے بہت کم خالی نظر آتا ہے یا تو مطالعۂ کتب مین مشغول ہوتا ہے۔ یا گانا سُنتا ہے۔ موسیقی سے اکتاتا ہے تو مطالعہ کتب مین اسکی تفریح ہوتی ہے۔ اور مطالعۂ کتب سے دل اچاٹ ہوتا ہے تو اچھے گلے کی تانین اُسکا دل بہلاتی ہین۔

اسکے علاوہ دو شوق بھی ہین۔ ایک تو اچھی سواری کا۔ اور دوسرے اچھی نزہت گاہون اور پُر فضا باغون اور وادیون کی سیر کا۔ بادشاہون اور امیرون کے پاس اکثر جاتا ہے۔ اور جاتا ہے یون کہنا چاہیئے کہ اُس کا کمال اور اسکی حذاقت کھینچ لے جاتی ہے۔ جہان اُسکی قدر منزلت ہوتی ہے۔ خود اُمرا و سلاطین اُسکے سامنے جھکتے ہین۔ اور دشوار علاجون مین اُسے بہت کچھ انعام و اکرام دیتے ہین۔ مگر باوجود اسکے اُسے اِس سے نفرت ہے کہ کسی کا پابند بن کے رہے۔ ہان کسی امیر کے ہاتھ مین چاہے وہ کیسا ہی فیاض و قدردان ہو رہن ہو جائے۔ حتی کہ کوئی بادشاہ زبردستیان کرکے اور جبراً و قہراً اسے اپنا پابند بنانا چاہتا تو وہ شہر چھوڑ کے بھاگ کھڑا ہوتا۔ اور اُس کی قلمرو سے نکل جاتا۔

الغرض ایسا تھا وہ جالینوس جس کا نام ہماری صحبتون مین اسقدر مشہور ہے۔ اور جسکے کمالات نے دنیا کو اسقدر اپنا زیر احسان بنا رکھا ہے۔ اگرچہ وہ اُس زمانے مین تھا جب کہ حضرت مسیح اپنے برحق دین کو

تبلیغ فرما چکے تھے۔ مگر اُس نے دینِ مسیحی کو نہین قبول کیا۔ اور اُن ہدایتون سے محروم رہا جن کا سرچشمہ ارض فلسطین تھی۔ تاہم ہم دُعا کرتے ہین کہ خدا اس کی مغفرت کرے۔ اور کیا عجب کہ اُسکی بنی نوع کی خدمت گزاری اور اُس کے رحمدلی و خدا ترسی کے اوصاف نے شفاعت کرکے اُسکو نجات دلا دی ہو۔

سائدین

حضرت مسیح سے پیشتر ساتوین صدی کے وسط مین جب یونانی لوگ بحر اسود کے شمالی سواحل پر جا جا کے بسنے لگے تو انھین موجودہ مملکت روس کے جنوبی میدانون مین ایک خانہ بدوش قوم نظر آئی جس کا عام مشغلہ مویشیون کو پالنا اور چرانا تھا۔ اس قوم کو انھون نے سائدین کے لقب سے یاد کرنا شروع کیا چند روز بعد یہ قوم اپنے مویشیون کے گلّون کو ہنکاتی ہوئی بڑھنے اور پھیلنے لگی۔ اور بڑھتے بڑھتے وسط ایشیا تک آ پہنچی۔ اور تبت و ترکستان پر متصرف ہوگئی۔ پھر چند روز بعد اسمین فتحمندی و حکمرانی کا اسقدر حوصلہ بڑھ گیا کہ ہندوستان مین اسکندر اعظم جس یونانی دولت کو قائم کر گیا تھا اُسے ان لوگون نے بیخ و بنیاد سے اُکھاڑ کے پھینک دیا۔

اکثر لوگون کا خیال ہے کہ مُسلمان مورخین ان لوگون کے حالات سے بالکل ناواقف تھے۔ اس غلط فہمی کا اصلی سبب یہ ہے کہ "سائدیا" کا لفظ اُنکی تاریخون مین کہین نہین ملتا۔ اور لوگ یہ نہین جانتے کہ اصل مین یہ خطا کا لفظ ہے جو انگریزی مین بگڑکے سائدیا بن گیا ہے۔ یونانی فی الحال ایک مردہ زبان ہے لہذا اُسکے الفاظ کا صحیح تلفظ مشکل سے معلوم ہو سکتا ہے شائدیا کا املا یورپ کی تحریر مین . . . . ہے جہان تک ہمین

پتہ لگا ہے اُسمین ''خ'' تو نہ تھا مگر اسمین شک نہین کہ حرف ''سی'' کا تلفظ ''ق''
کا تھا۔ اِس لفظ مین ''خ'' کا تلفظ ادا کرنے کے لئے اُنھون نے غالباً یہ کارروائی
کی کہ ''سی'' کے ساتھ ایک حرف ''اس'' بھی بڑھا دیا۔ حرف ''وائی''
حرکت کا کام دینے کے محل پر یونانی لاطینی اور نیز فرانسیسی مین صرف کھڑے زیر
یعنے ''ای'' کی آواز دیتا ہے۔ یہ صرف انگریزی مین ہے اور شاید دوسری ٹیوٹانک
زبانون جرمن وغیرہ مین بھی ہو کہ دائی حرکت کے محل پر ''آئی'' کی آواز بھی دیتا
ہے۔ حروف ٹی ایچ۔ باہم مل کے ''ذ'' کی آواز صرف انگریزی مین دیتے ہین۔
فرانسیسی مین انکا عام تلفظ ''ت'' کا ہے۔ یونانی مین ممکن ہے کہ ''ط'' کا تلفظ ہو
لہذا یہی لفظ جسکا انگریزی تلفظ سائدیا ہے یونانی مین اسکا تلفظ ''خیطیا'' ہونا
چاہیئے۔ آخری ''ی'' اور ''الف'' قطعاً یونانیون کے بڑھائے ہوئے ہین اسلئے
کہ اُنکی زبان مین ''ایا'' کا ٹکڑا زمین اور ملک کے معنے پیدا کر دیتا تھا۔ اور وہ ہر
ملک کے نام مین اِس ٹکڑے کو لگا دیا کرتے تھے۔ جیسے عرب کو وہ ''اربیا''
پارس کو ''پرسیا'' ہند کو ''انڈیا'' کہنے لگے۔ اُسی طرح یقیناً اُنھون نے ''خیطا''
کے لفظ کو ''خیطیا'' بنا دیا ہوگا۔ عربون نے اس مین صرف اتنا تصرف کیا کہ اعرابی
حرف ''ی'' کو گرا کے خطا بنا لیا۔

غرض اصلی نام اس قدیم سرزمین اور ملک کا خطا ہی ہے جو بگڑ کے انگریزی مین
''سائدیا'' بن گیا۔ ان دونون نامون کے ایک ہونے کی مادی شہادت یہ بھی ہے
کہ روضۃ الصفا وغیرہ مین جو حالات قوم خطا کے بیان کئے گئے ہین وہی انگریزی
مین سائدین بادشاہون اور تاجدارون کے حالات مین مذکور ہین۔
گو مسلمانون کی تاریخون سے یہ پتہ نہین چل سکتا کہ اس قوم کا
اصلی وطن اور سرچشمہ کونسی سرزمین تھی۔ وہ اسے صرف اُسی

وقت سے جانتے ہین جب کہ یہ قوم ترکستان اور تبت مین آکے آباد ہوئی چنانچہ اسی بنیاد پر وہ تبت ہی کو خطا خیال کرتے ہین -

لیکن اس قوم کے حالات وقوانین بالکل نئی طرح کے اور بہت انوکھے ہین جنکو ہم انسائکلوپیڈیا برٹانکا سے نقل کرکے ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہین یہ اُنکی معاشرت بالکل گڈریون کی سی تھی - مرغزارون اور وادیون مین یہ لوگ مارے مارے پھرتے تھے - ایک سبزہ زار مین جب اپنے مویشی چرا چکتے تو دوسرے سرسبز اور تر وتازہ مرغزار کو ڈھونڈھ نکالتے - انکے کوچ اور روانگی کی یہ شان تھی کہ آگے آگے بھیڑ بکریون کے بڑے بھاری گلّے اُن کے پیچھے گھوڑون پر سوار مرد اور ساتھ ساتھ عورتین جو بیل گاڑیون پر لدی ہوتین اور دھوپ سے بچنے کے لئے اُن گاڑیون پر چمڑے کے سائبان ہوتے - اُبلا ہوا گوشت گھوڑی کا دودھ اور پنیر اُنکی غذا تھی - نہاتے کبھی نہ تھے - مگر اس کے عوض اُن مین یہ ایک عجیب رسم تھا کہ کوئی خواب آور نشی چیز استعمال کرتے پھر چمڑے کے خلوت خانون مین بیٹھتے - اور خوب گرم کئے ہوئے پتھرون پر پٹوے ربلینے سن کے بیجون کو ڈال کے دھونی لیتے - اور پسینہ نکالتے - عورتین نہانے کے عوض یہ کرتین کہ خوشبودار لکڑیون کے ڈھورے کی چٹنی سی بنا کے اُبٹنے کی طرح سارے پنڈے مین لگاتین اور دوسرے دن چھڑا ڈالتین - دیگر وحشی قومون کی طرح اہل خطا کے بدن بھی بقراط کے بیان کے مطابق فربہ - موٹے - اور ڈھل ڈھلے ہوتے تھے - مفاصل پر کثرت سے چربی ہوتی تھی - اور چہرے کسی قدر سرخی مائل تھے - اُن مین اکثر پیچش اور وجع مفاصل کی شکایت رہتی تھی - جس کا علاج وہ داغ کے کیا کرتے تھے -

مذکورۂ شکل وشمائل کا خیال کر کے بعض لوگون نے یہ رائے قائم کی کہ وہ قوم مغول مین سے تھے۔ لیکن اگر اُنکی زبان کا لحاظ کیا جائے تو یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ مغل نہین اُنکی قوم بھی آریہ قوم کی ایک شاخ تھی۔ اور وہ ایرانیون سے قریبی قرابت رکھتے تھے اُنکے مذہب پر نظر ڈالی جائے اور اُنکے دیوتاؤن کو دیکھا جائے تو بھی اُن مین آریہ قوم ہی کی شان ثابت ہوتی ہے۔ اُنکی سب سے بڑی دیوی "بتی تی" تھی جو چولھے کی دیوی تھی۔ اسکے بعد آسمان کا دیوتا "پاپوس" تھا۔ اور اُسکی بی بی زمین کی دیوی "آپیا" تھی۔ سورج دیوتا کو "اُوتوسی رس" کہتے تھے۔ اُنکے جس گروہ کے ہاتھ مین حکومت تھی اُسکا ایک سمندر کا دیوتا بھی تھا جس کا نام "تھی ماساواس" تھا۔ ایرانیون کی وضع کے موافق ان دیوتاؤن اور دیویون کی پرستش بغیر کسی مورت کے کی جاتی تھی۔ یعنے اُن مین مورتون کا رواج نہ تھا۔ نہ بُت خانون کا رنہ چڑھاوے کے مقامات بنانے کا۔ ہان "آرس" نام ایک دیوتا کے نام سے (اس دیوتا کا نام ہیرو ڈوٹوس مورخ نے اپنے یونانی دیوتا کا نام بتا دیا) لکڑیون کا ڈھیر لگا کے ایک بڑی بھاری قربان گاہ بنائی جاتی۔ اور اُس پر دیوتا کی یادگار مین ایک تلوار رکھ دی جاتی۔ اُسپر سالانہ بہت سے بیل اور بھیڑین بھینٹ چڑھائی جاتین۔ اور لڑائیون مین جو قیدی ہاتھ آتے اُن مین سے بھی چوتھائی آدمی اس پر چڑھا دیئے جاتے اُن مین کسی کی جان لینے اور غالباً بھینٹ کرنے کا طریقہ گلا گھونٹنا تھا۔ کاہنون (یعنے غیب کی باتین بتانے والون کی اُن مین کثرت تھی۔ اور ان مین سے ایک گروہ جو ایک خاص نسل مین سے تھا "اُنا رین" کہلاتا تھا بہت محترم خیال کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ اپنی نسل کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ کبھی اُنھون نے آسمان کی دیوی کو ایذا پہنچائی تھی جس کے انتقام مین دیوی نے اُنھین

یہ سزا دی کہ قوت رجولیت اُن مین سے سلب کر دی - اسی وجہ سے یہ لوگ عورتون
کے سے کپڑے پہنتے - عورتون ہی کے ایسے کام کرتے - اور زنانی آواز مین باتین
کرتے - غیب کی باتین بتانے مین قدیم اہل جرمن کی طرح یہ لوگ بھی لچکدار
ٹہنیون کو کام مین لاتے - فرق اتنا تھا کہ خطا والون کے اناریں لوگ اس موقع
پر لیمون کی ٹہنیون کی چھال کام مین لاتے تھے - جو لوگ کاہن نہ ہون اور کاہن
ہونے کا دعوے کرین وہ چرپہیہ گاڑیون پر باندھکے بٹھا دیئے جاتے اور
اُن مین ایک ایک جلتی ہوئی جھاڑ دبھی باندہ دی جاتی - پھر وہ گاڑیان بھگائی
جاتین اور باہم مقابلہ کیا جاتا کہ کون گاڑی آگے نکل جاتی ہے -

معاہدہ کی تکمیل یون ہوتی کہ شراب مین متقابل فریقین کا تھوڑا تھوڑا خون
نکال کے ملا دیا جاتا اور اُسے دونون پی جاتے - بادشاہ کبھی بیمار ہوتا تو خیال
کیا جاتا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی نے اپنے چولھے کی دیویون کی جھوٹی قسم کھائی
ہے - اور جس بدنصیب کی نسبت کاہن لوگ یا اُنکی غالب جماعت تصفیہ کر دیتی
کہ یہی اس جرم کا مرتکب ہے اُسکا سر کاٹ ڈالا جاتا - بادشاہ کسی شخص کی
نسبت قتل کا حکم جاری کرتا تو اُسکے ساتھ اُسکے تمام مرد عزیز دار بھی قتل
کر ڈالے جاتے اس اندیشہ سے کہ ممکن ہے کوئی انتقام کی کوشش کرے بادشاہ
کے دربار مین جو شخص مقدمہ جیت جاتا اُسے اس بات کا حق حاصل ہوتا کہ اپنے
فریق مخالف کی کھوپری لے اور اُسے اپنا جام شراب بنائے -

اہل خطا لڑائی مین ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہو کے جاتے اور تیر کمان سے
دشمن پر نشانہ بازی کرتے - اور لڑائی مین جو شخص پہلے مارا جاتا قاتل اُس کا خون
پی لیتا - اور اس سے یہ امید ہوتی کہ مقتول کی شجاعت بھی اُسمین آجائے گی -
جو شخص بادشاہ کے سامنے کسی دشمن کا سر لاکے نہ پیش کرتا وہ مال غنیمت مین سے

کچھ پانے کا مستحق نہ خیال کیا جاتا - اُن سرون مین سے کھوپڑی کا چمڑا نکال کے مدبوغ کیا جاتا اور لگاموں مین لگایا جاتا - جتنے دشمن گرفتار کئے جاتے اُنکے ساتھ سب سے پہلے یہ سلوک ہوتا کہ اُنکی آنکھین پھوڑ دی جاتین - اور اسمین مصلحت یہ بتائی جاتی کہ گھوڑیون کے دودھ کا مکھن جو ہماری دہنیڈیون مین رہا کرتا ہے اُسے چرا نہ سکین گے -

اُن مین سلطنت بالکل شخصی تھی جس کا ثبوت سب سے زیادہ اُن کے بادشاہون کی تجہیز و تکفین کے رسوم سے ملتا ہے - معمولی لوگون کی لاش ۴۰ دن تک پھرائی جاتی تھی - اور مرحوم کا ہر دوست جو تعزیت کو آتا ایک عوت دیتا مگر بادشاہون کی لاش محنط کر کے ہر ہر گروہ اور جماعت مین پھرائی جاتی اور ہر گروہ کے آدمی جنازے کی مشایعت اِس شان سے کرتے کہ اُنکا سارا جسم زخمی ہوتا - ایسے جلوس کے ساتھ بادشاہ کا جنازہ شاہی قبرستان مین پہنچتا جو مقام "گرہی" مین تھا - یہان بادشاہ کی لاش دفن کی جاتی اور اُسکے ساتھ اُسکی ایک حرم - اُسکا ساقی - باورچی - سائیس - عرض بیگی - اور سفیر بھی قتل کر کے دفن کر دئے جاتے - قبر کے اوپر ایک بڑا وسیع اور اونچا چبوترہ بنایا جاتا جس مین گھوڑے اور سونے کے ظروف بھی گاڑ دئے جاتے تھے ایسے متعدد چبوترون کا دریائے ڈنائیپر اور دریائے نقاق کے سرچشمہ کے درمیان مین پتہ لگا ہے جو وہان وہ تاتاری "کرغان" کے نام سے مشہور ہین - اِسکے بعد جب پہلی برسی ہوتی اور دیسے کا رسم بجا لایا جاتا تو اُس وقت بھی پچاس گھوڑے اور پچاس خطائی الاصل آزاد نوجوان جو بادشاہ کے خدمت گار ہوتے لے جا کے بھینٹ چڑھاتے جاتے اُن پچاس خدام مین کے ہر ایک ایک گھوڑے مین باندھ دیا جاتا - اور یہ سمجھا جاتا کہ یہ سوار بادشاہ متوفی کے دربان و محافظ رہین گے -

خطائی لوگ اپنی نسبت یہ خیال رکھتے تھے کہ اس سرزمین پر وہ کہین سے آکے آباد نہین ہوئے بلکہ اصلی باشندے اسی سرزمین کے ہین - اور اپنے مقتدا اروٹار گیڈوس ؟ کی نسبت اعتقاد رکھتے تھے - کہ وہ آسمان کے دیوتا کا بیٹا ہے جو دریائے ڈنائیپر کی ایک بیٹی کے بطن سے پیدا ہوا ہے - اور انھین کے حساب سے اُسکا زمانہ ۱۵۰۰ قبل مسیح سے بھی ایک ہزار سال پیشتر تھا - اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنکی سلطنت کا اصلی گہوارہ یہی ڈنائیپر تھا - جو جنوبی و مغربی روس مین ہے مشرق کی طرف وہ بعد کے زمانے مین آئے اور سارے وسط ایشیا اور مغربی و شمالی ہندوستان پر قابض ہو گئے -

اعزالدین حسین

گزشتہ کارنامون اور اگلی کہانیون مین ہمین بعض ایسی عبرت ناک باتین اور خدا کی قدرت کے ایسے حیرت انگیز نمونے نظر آجاتے ہین کہ اُن کا نقش دل پر بہت گہرا پڑجاتا ہے اور مٹائے نہین مٹتا - نورجہان بیگم جسکا نام کبھی ہندوستان کے سکہ پر منقوش تھا - اور ملک مملکت کے سیاہ و سفید کی مالک تھی اُسکی پیدایش کا واقعہ بارہا عبرت خیز الفاظ مین بیان کیا گیا ہے جس سے اکثر ناظرین واقف ہونگے اور حیرت کرتے ہونگے کہ جب خدا کسی پر مہربان ہوتا ہے تو کیسے کیسے حیرت انگیز طریقون سے اُسکی اعانت کرتا ہے - اور جب کسی کو بگاڑنا چاہتا ہے تو کسطرح وہ اپنی ترقی کی کوششون مین ناکام ہو کے قعر مذلت مین گرتا ہے -

دولت غوریہ کا حال صفحات تاریخ پر لکھا ہوا ہے - اور مورخین کے قلم شہادت دے رہے ہین کہ سلطان معزالدین غوری و سلطان غیاث الدین غوری کے کارنامے کیسے عروج و اقبال اور کیسی دولتمندی و فتحیابی کی آن بان

دکھا رہے تھے۔ مگر لوگوں نے شاید اس پر غور نہ کیا ہوگا کہ غوری لوگ تھے کون اور اپنے اس اوج و عروج سے پہلے کس حضیض ادبار میں پڑے ہوئے تھے۔

خدا جانے جھوٹ یا سچ مگر کہتے ہیں کہ ضحاک تازی جس نے قدیم الایام اور تاریخ ایران کے ابتدائی دور میں اہل عجم کو عرب کی شجاعت و سپہگری کا مزہ چکھا دیا تھا۔ اُس کے دو نواسے سوری اور سام فریدون کی ملازمت میں تھے جب ضحاک کے وابستگان دامن کا قلع و قمع ہونے لگا۔ اور کوشش شروع ہوئی اُس کی نسل ہی صفحۂ ہستی سے مٹا دی جائے تو وہ دونوں بھائی دربار فریدون سے بھاگ کے نہاوند میں پناہ گزین ہوئے۔ یہاں سام کے بیٹے شجاع کی شادی سوری کی بیٹی سے ہوئی۔ اتفاقاً چچا جو خسر بھی تھا اپنے داماد بھتیجے کے خون کا پیاسا ہوگیا۔ شجاع کا یہ حال اپنی ہم دم و ہمراز بی بی سے معلوم ہوا تو بال بچوں کو لے کے نہاوند سے بھاگا اور کوہستان غور میں آ کے اقامت گزین ہوا۔ یہاں اس کی اولاد بڑی پھیلی۔ اور اس سرزمین کی حکومت اُس کے ہاتھ میں رہی۔ آخر اسی نسل کا ایک شخص جسکا نام شنست بتایا جاتا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں خلعت اسلام سے سرفراز ہوا۔ اور اسی نسبت سے یہ نسل بعد کے زمانے میں شنسبی کے لقب سے مشہور ہوئی۔ اور اُسکا یہ فخر بہت بجا ہے کہ بنی اُمیہ کے زمانے میں جبکہ تمام منابر اسلام پر اہل بیت نبوت کی شان سب و شتم کے الفاظ کہے جاتے تھے۔ ان لوگوں نے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی مبارک نسل کو کبھی ناپاک الفاظ سے نہیں یاد کیا۔ حتے کہ جب ابومسلم خراسانی اپنا سیاہ جھنڈا بلند کر کے بنی اُمیہ کے استیصال کے لئے اٹھا ہے تو اس خاندان کا بہادر سردار فولاد شنسبی اُس کے ساتھ تھا۔

سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں بھی یہ خاندان بدستور اپنی قلمرو پر

متصرف رہا۔ صرف اتنا ہوا کہ محمود نے محمد بن سوری کو اپنی طرف سے وارث تخت غور قرار دیا۔ ابو علی مذکور کے عباس نام ایک بھتیجے نے اُسے آبائی ریاست سے محروم کر کے تاج و تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور کہتے ہیں کہ اُس کی اس غاصبانہ کارروائی پر یہ غضب آلہی نازل ہوا کہ سات سال تک علاقہ غور میں پانی نہ برسا اور سخت قحط پڑ گیا۔ اور اس سے بھی زیادہ قیامت یہ تھی کہ سات برس تک اس مملکت میں انسان تو انسان مویشیون تک کے بچے نہ ہوتے۔ آخر اُسے سلطان ابراہیم غزنوی نے ایک معرکے میں شکست دے کے قید کر لیا اور اُس کا بیٹا محمد بن عباس وارث سلطنت ہوا۔ اسی کے بیٹے قطب الدین حسن محمد بن عباس شنبی کی نسل سے تمام شاہان غور ہیں

قطب الدین سے شاہان غزنویہ سے لڑائی ہوئی جس میں اُس کی حکومت جاتی رہی۔ اور سارے علاقے پر دولت غزنویہ کا قبضہ ہو گیا۔ قطب الدین کا بیٹا سام اپنے ملک۔ خاندان اور قوم کی تباہی و پامالی کا تماشا دیکھ کے ہندوستان کے طرف بھاگا اور یہان آ کے تجارت کرنے لگا۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے تو اکیلا یہی ایک شخص اس پُرانے خاندان کی یادگار ہے۔ اور اسی کی نسل سے وہ سلاطین عظام پیدا ہونے والے ہیں جو آیندہ ہندوستان سے لے کے حدود عراق تک ساری اسلامی دنیا کے مالک ہون گے۔ جن کے آگے بڑے بڑے سرکشوں اور زبردست سے زبردست تاجدارون کے سر جھکتے ہون گے۔ مگر وہ تو جب ہوگا ہوگا۔ سردست یہ تو دیکھو کہ اس وقت یہ غریب کس حالت میں ہے۔ اور کیسی مصیبتین جھیل رہا ہے۔

ہندوستان کے شہرون میں تجارت کر رہا تھا کہ وطن یاد آیا۔ ایک آہ کلیجے سے نکلی اور کسی دلدوز تیر کی طرح کلیجے ہی میں ٹوٹ کے رہ گئی۔ دل میں آئی کہ چاہے جو ہو۔ ذرا وطن کی صورت تو چل کے دیکھ آؤ۔ بال بچون کو ایک کشتی پر سوار

کرایا اور دریائے سندھ اور دریائے کابل کا چڑھاؤ کاٹتا ہوا دریا کے راستے سے وطن کی طرف روانہ ہوا راستے میں ایک ایسی آندھی آئی کہ کشتی تباہ ہو کے ڈوب گئی۔ اور دیدار وطن کے ان مصیبت زدہ آرزومندوں نے قعر دریا میں آنکھیں بند کیں تو خواب گاہ عدم میں جا پہنچے۔ صرف سام کا بیٹا اعزالدین حسین اتفاقاً بچ گیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ خودکشی پر آمادہ ہو جاتا۔ مگر مصیبت جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ تو انسان کو سب باتیں بھول جاتی ہیں اور سوا اپنی جان بچانے کے کچھ نہیں یاد رہتا۔

اتفاق سے ایک ٹوٹا تختہ نوعمر اعزالدین حسین کے ہاتھ میں آگیا۔ اور فوراً بمصداق الغریق یتشبث بالحشیش۔ اُس پر بیٹھ گیا کہ شاید جان بچ جائے۔ خدا کی قدرت سیلاب کی شدت اور طوفان کی مصیبت سے ایک شیر بھی دریا میں ہاتھ پاؤں مارتا اُس تختے کے قریب پہنچا۔ اور وہ بھی اُس تختے پر نہایت مسکینی کی شان سے آگے بیٹھ گیا۔ اس طرح اعزالدین حسین اور شیر تین رات دن تک بھوکے پیاسے ایک دوسرے کے ہم صحبت اور بے آزار رفیق سفر رہے۔ اب اس تختے کو ہوا اور موجوں نے کنارے جا لگایا تو دونوں کی جان میں جان آئی۔ شیر نے تختے سے کود کے جنگل کی راہ لی۔ اور اعزالدین حسین آبادی کی تلاش میں روانہ ہوا۔

تھوڑی ہی دیر دشت نوردی کی تھی کہ ایک شہر نظر آیا۔ اعزالدین حسین دن بھر اُس کے گلی کوچوں میں خاک اڑاتا پھرا۔ اور رات ہوئی تو خانمان برباد۔ غریب الوطنوں کی طرح ایک دکان میں پڑ کے بھوکا پیاسا سو گیا۔ رات کو کوتوال شہر مع چند کوتوالی کے جوانوں کے اُدھر سے گزرا۔ اور ایک اجنبی شخص کو اُس دکان میں خراٹے لیتے دیکھ کے ٹھہرا۔ اور کہا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کوئی چور ہے۔ چوری کی

تاک میں پھرتے پھرتے یہاں سو گیا۔ کوتوال صاحب کے دل میں یہ خیال آیا تو پھر اُسے کون بچا سکتا تھا۔ فوراً مشکیں کس لی گئیں۔ اور معمولی تحقیقات کے بعد غریب قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

بے گناہ عزالدین حسین سات برس تک اسی قید خانے میں رہا۔ جبکہ نہ دنیا میں کوئی اس پر ترس کھانے والا تھا۔ اور نہ کوئی اس کی مصیبت پر رونیوالا۔ سات برس بعد اتفاق سے حاکم شہر کسی سخت مرض میں مبتلا ہوا۔ جہاں حصول شفا کی تدبیریں کی گئیں۔ وہاں کچھ قیدی بھی چھوڑے گئے۔ قسمت کچھ موافق ہوئی تھی کہ اس سلسلے میں اُسے بھی نجات ملی۔ اور چھوٹتے ہی سیدھا شہر غزنی کو روانہ ہوا۔ جو ان دنوں مشرقی دُنیا میں سب سے زیادہ نامی گرامی اور باعظمت وجبروت شہر اور اس عہد کا بابل تھا۔

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب اعزالدین حسین کی مصیبت کٹ گئی اور عنقریب کامیابی و مقصد وری کے ساتھ وطن کی صورت دیکھے گا۔ مگر ابھی بری قسمت نے ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ غزنین کے اطراف میں اُن دنوں تاخت و تاراج اور لوٹ مار کا بازار اکثر گرم رہا کرتا تھا اور اکثر مسافروں کو لٹیرے اور رہزن لوٹ لیا کرتے تھے۔ وہ تن تنہا چلا جاتا تھا۔ کہ رہزنوں کے ایک گروہ سے دو چار ہوا۔ ان لوگوں نے اعزالدین حسین کو خوش رو و نوعمر اچھے قد و قامت کا جوان دیکھا۔ تو استمالت و خاطرداری کر کے اپنے ساتھ کیا اور اپنا دوست بنایا ایک اچھا گھوڑا اور قیمتی اسلحہ دیئے اور لوٹ مار کے شوق میں روانہ ہوئے

اتفاق یا قسمت جس رات اعزالدین اور ڈاکوؤں کا ساتھ ہوا ہے۔ اس کی صبح کو وہ سب ڈاکو شاہی فوج کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے۔ جو

غارت ورازے اُن کی تاک میں تھی۔ ان دنون سلطان ابراہیم غزنوی کا زمانہ تھا۔
یہ سب ڈاکو شاہی دربار میں پیش ہو کے واجب القتل قرار دیئے گئے دوچار روز
بعد اس حکم کی تعمیل ہونے لگی۔ عام خلقت کے مجمع میں ایک ایک ڈاکو سامنے لایا
جاتا۔ اُس کی آنکھون پر پٹی باندہی جاتی تھی۔ اور جلاد سیفے کے زبردست وار
سے سر اُڑا دیتا۔ اعزالدین حسین نے اس وقت تک تو مصائب زمانہ کو صبر وشکر
سے برداشت کیا تھا۔ مگر اب صبر کی باگ ہاتھ سے نکل گئی۔ جب جلاد اُسے قتل
کرنے کے لئے لایا۔ اور آنکھ پر پٹی باندہنے لگا تو بے اختیار اعزالدین کے
آنسو جاری ہوگئے۔ اور ایک آہ فلک دوز کے ساتھ زبان سے یہ الفاظ نکلے خداوند
جانتا ہون کہ تجھہ سے غلطی نہین ہوسکتی اور تیری ذات پاک ظلم وجور سے مبرا ہے۔
لیکن آخر بے گناہ کیون مارا جاتا ہون؟" اُس پر جلاد نے کہا "تم اور بے گناہ
مدتون رہزنی کی لوگون کو لوٹا مارا سلطان وقت سے سرتابی اور بغاوت کرتے
رہے اور پھر بھی بے خطا وقصور ہو؟" اعزالدین نے بیان کیا کہ "مجھہ سے تو کل
ہی رات کو ان لوگون سے ملاقات ہوئی تھی۔ مجھسے اتنا البتہ قصور ہوا کہ ان کے ساتھہ
ہوگیا ورنہ جانتا بھی نہین کہ یہ کون لوگ تھے ان کے کیا افعال تھے۔ اور کن گناہون
مین مبتلا رہے تھے۔ اسی سلسلے میں اُس نے اپنی ساری سرگذشت کہہ سنائی
جلاد کو یہ پر درد داستان سن کے ترس آگیا فوراً اپنے افسر کے پاس دوڑا گیا
اور کل حال بیان کر دیا اُس کے دل میں خدا نے کچھہ ایسی نیکی ڈال دی کہ یہ کیفیت
سلطان ابراہیم غزنوی کے حضور میں عرض کی سلطان نے متعجب ہو کے اعزالدین کو
اپنے سامنے بلوایا۔ اور اُس کی سرگذشت خود اُسی کی زبان سے سنی۔

اس پر درد داستان نے بادشاہ پر اس قدر اثر کیا کہ فوراً جان بخشی کردی
پھر اُس کے چہرے اور بشرے کو غور سے دیکھا اور شرافت خاندانی کے آثار

نظر آئے تو اپنے دربار میں رکھ کے اُس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ تعلیم کے اثر سے جوہر شرافت چمکنے لگا تو اُسے عزت دے کے اپنے مقربین دربار میں شامل کر لیا اور عرض بیگی اور حاجب کی خدمت اُس کے سپرد کی۔ آخر حسن خدمت اور اپنے ادب و شائستگی کی بدولت وہ یہاں تک بادشاہ کا منظور نظر ہوا کہ ایک شاہی خاندان کی لڑکی اُس کے عقد نکاح میں دے دی گئی جس کے بعد اُس کی عزت و حرمت اور قدر و منزلت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

اعزالدین حسین کو اس قدر اوج و عروج حاصل ہو چکا تھا کہ زمانے نے سلطنت کا ورق اُلٹا۔ سلطان ابراہیم غزنوی آغوش لحد میں سویا اور تخت سلطنت پر مسعود ابن ابراہیم غزنوی جلوہ افروز ہوا۔ مسعود مرحوم باپ سے بھی زیادہ اعزالدین پر مہربان تھا۔ اُس نے تھوڑے ہی زمانے میں اُسے غور کا والی و حکمران مقرر کر دیا۔ اس طرح انقلاب زمانہ کا تماشا اور نیرنگی فلک کے کرشمے دیکھ کے اعزالدین حسین اپنے اُسی وطن میں حاکم اور تمام سیاہ و سفید کا مالک بن کے پہنچا جسکے دیدکی آرزو اور گوشش میں اسکے باپ اور سارے خاندان کو سوا ناکامی اور نامرادی کی موت کے کچھ نہ نصیب ہو سکا۔ یا یوں کہا جائے کہ ہندوستان سے جو تاجرانہ قافلہ ارض غور کے دید کی دھن میں چلا تھا وہ سب تباہ و برباد اور نذر اجل ہوا اب اُس میں کا صرف ایک پس ماندہ زمانے کی مار کھا کے اور بار بار موت کی صورت دیکھ کے سواد وطن میں داخل ہوا ہے۔ تو کس شان اور کس آن بان سے کہ ساری زمین اُسی کے قبضہ اقتدار میں ہے۔

اعزالدین حسین کو اُسی غزنوی گھرانے کی خاتون کے بطن سے خدا نے سات بہادر اور زبردست بیٹے عطا کئے جو اپنی ناموری و شہرت کے اعتبار سے

کواکب سبعہ، کہلاتے تھے۔ اور ساتوں مختلف مقامات و بلاد کے حاکم و سریرآرا تھے۔ جن میں سب سے زیادہ خوش نصیب بہاؤالدین سام تھا۔ جس کے دو فرزندون سلطان غیاث الدین اور سلطان شہاب الدین نے دولت غوریہ کی بنیاد ڈالی۔ اور حدود بنگالہ سے لے کے ارض عراق تک تمام ملکون کی قسمت کے مالک تھے۔ سلطان کا لقب سب کے سیف الدین غوری نے تخت غزنین پر بیٹھ کے اختیار کیا جو انھیں کواکب سبعہ میں سے ہے۔ یعنی اعزالدین حسین کا بیٹا۔ بہاؤالدین سام کا بھائی۔ اور سلطان غیاث الدین و شہاب الدین کا چچا تھا۔

جس وقت اعزالدین حسین اُس شکستہ پڑے پر شیر کے پہلو میں بیٹھا موجون کے تھپیڑے کھا رہا تھا۔ اور زندگی سے اس قدر مایوس تھا کہ نہ اُٹھے۔ اپنے ہم پہلو شیر کا خوف تھا اور نہ شیر کو اُس کی جان لینے کا خیال اُس وقت بھلا اُس کے دل میں بھی یہ بات گزر سکتی تھی کہ عنقریب اسی کی نسل میں سریرآرائی و جہانبانی ہوگی یا جلادنے جس وقت اُس کی جان لینے کے لئے تلوار ہاتھ میں تولی تھی اُس وقت کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات ہو سکتی کہ جس تاجدار کے حکم سے وہ گردن زدنی قرار پایا ہے۔ اُس کے پرچم اقبال کو اسی قریب القتل شخص کی اولاد پامال کریگی؟ ہرگز نہین۔ لیکن خوب یاد رکھو کہ ہمارے وہم وگمان میں ہو یا نہ ہو دنیا میں ایسے انقلابات بہت نظر آئے ہیں۔ اور زمانے کا یہی دلچسپ مشغلہ ہے۔ ایسے واقعات گو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں مگر اکثر پیش آسکتے ہیں۔ اور یہی واقعات ہیں جو ہمین انتہا سے زیادہ ناکامی کی حالت میں بھی مایوس نہین ہونے دیتے سچ یہ ہے۔ کہ بادی النظر میں چاہے کیسے ہی آثار نظر آتے ہون۔ مگر قسمت جب تک کوئی کام کر نہ گزرے ہم نہین جان سکتے ہیں کہ کیا کرنے والی ہے۔

سباتائی سیوی

ہندوستان میں یہ لفظ شاید اس سے پیشتر کبھی نہ سنا گیا ہوگا۔ اور ہمارے ہم وطنوں کو اپنی ناواقفیت پر کس قدر افسوس ہوگا۔ جب وہ یہ سنیں گے کہ یہ ایک مذہب ہے جو اس وقت تک زندہ موجود ہے۔ اور دولت عثمانیہ کے یہودیوں اس کے پیرو کثرت سے پائے جاتے ہیں گو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دولمہ یہودیوں ہی کا ایک فرقہ ہے مگر سچ یہ ہے۔ کہ وہ آپ کو یہود سے علیحدہ باور کرتے ہیں وہ خود آپکو قامینی (ایمانذا) کہتے ہیں۔ یہ دون کا لقب انہیں ترکوں نے دیا ہے جس لفظ کے معنے پھرے ہوئے یا مرتد" کے ہیں

موجودہ عہد میں بعض لوگ پیغمبری یا الہامی قوت کا دعوے کرتے ہیں تو لوگوں کو تعجب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس لئے کہ خداوند جل و علا جہان ہر قسم کے لوگوں کو پیدا کرتا ہے۔ وہاں اس قسم کے اشخاص بھی ہمیشہ اور ہر زمانے میں پیدا ہوتے ہیں جو اپنی وضع و حالت کے مناسب تھوڑے بہت پیرو ضرور پالیا کرتے ہیں۔ لہذا ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں ہی میں عبداللہ بن تومرت المہدی المغربی۔ سید محمود جون پوری مرزا علی محمد باب اور ہمارے معاصر مرزا غلام احمد صاحب قادیانی وغیرہ نے دعوائے نبوت و امامت نہیں کیا بلکہ دیگر ادیان و ملل میں بھی اس قسم کے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ یہی شان مسیحیوں میں بعض اوقات نظر آئی جس کا ایک حیرت انگیز نمونہ فرانس کی جون آف آرک تھی جسے انگریزوں نے پکڑ کے زندہ جلا دیا

اسی وضع پر یہودیوں اور خاص سلطنت عثمانیہ کی قلمرو کے اندر سترہویں صدی

عیسوی میں مذہب دُونِمہ نمودار ہوا جس کا بانی سبا تائی سیوی نامی ایک عجیب وغریب شخص تھا۔ اور جس نے ۱۶۶۶ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا سب سے پہلے مدعی مسیحیت تو حضرت مسیح تھے۔ جن کے دعوے کی قرآن پاک نے بھی تصدیق کر دی۔ مگر یہود انہیں (معاذ اللہ) جھوٹا مسیح ہی باور کرتے رہے۔ ڈاکٹر جان دی لنٹ سبا تائی کو اٹھارہواں مسیح کاذب بتاتے ہیں۔ مگر ہمیں اس سے بحث نہیں کہ وہ جھوٹا تھا یا سچا۔ اس مضمون میں ہم صرف اسی قدر بتانا چاہتے ہیں کہ سبا تائی کون اور کیسا شخص تھا۔ اور اس کے عقائد کیا تھے؟

سبا تائی سیوی ایشائی روم کے مشہور معروف شہر سمرنا میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں اس کا باپ ایک انگریز تاجر کے کارخانے کی دلالی کیا کرتا تھا بچپن ہی میں اُسے تعلیم کا شوق ہوا۔ باپ نے اس میں علم وفضل کی اہلیت دیکھی تو ایک ربانی[عہ] اسکول میں بھرتی کر دیا۔

یہاں اس نے طالمود[عہ] کے دوروں اور انکی روایتوں کی پوری تعلیم پائی پندرہ برس کی عمر کو پہنچا تھا کہ توراۃ وطالمود کی تعلیم سے فارغ ہو کے تاثیرات حروف واشارات اور جفر وغیرہ کی تحصیل میں منہمک ہو گیا۔ اس فن کا یہود میں زیادہ رواج ہے۔ اور اُن میں آیات توراۃ کے ہر ہر حرف کی جداگانہ تاثیر مانی جاتی ہے۔ مذہبی رمز شناسی کا بہت بڑا دار ومدار اسی فن پر ہے خلاصہ یہ کہ تھوڑی ہی عمر میں وہ ظاہری وباطنی رموز مذہب میں یکتائے روزگار ہو گیا۔

عہ یہود اپنے موجودہ مقتداؤں کو ربانی کہتے ہیں۔ اور اپنی شریعت کو ربانی شریعت اسی بنیاد پر انکے مذہبی مدارس بھی ربانی مدارس کہے جاتے ہیں۔

عہ توراۃ کے بعد جو روایتوں اور واقعات سلف کی کتابیں یہود کا دستور العمل ہیں اور جنکی پیروی واجبی بھی جاتی ہے۔ وہ طالمود کہلاتی ہیں۔

ابھی اٹھارہواں برس تھا کہ اہل علم و فضل کے دربار سے اُسے مقدس کا خطاب و لقب حاصل ہو گیا۔ اور بڑے بڑے مجمعوں میں وہ باطنی ملت پہ فصاحت و بلاغت اور زور و شور سے لکچر دینے لگا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد وقت آگیا کہ اُس کے ظرف کا پیمانہ جھلک جائے چنانچہ چوبیسویں برس اپنے شاگردوں اور مقلدوں کے سامنے دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ مسیح موعود ہوں جو حضرت داؤد کی اولاد میں ہوگا۔ اور یہود کو مسیحیوں اور مسلمانوں کی غلامی سے آزادی دلائیگا۔ اُس کے ساتھ ہی یہ حرکت کی کہ خدا و ند جل و علا کا نام یہوا جو یہود میں اسم ذات اور نہایت ہی جلالی خیال کیا جاتا ہے۔ اور جسے سوائے اس کے کہ سب سے بڑا مقتدائے دین خاص مقام اقدس والقدس میں صرف مخصوص قربانی کے دن اپنی زبان سے اداکرے اور کہیں کسی حال اور کسی زبان پہ لانا ہرگز جائز نہیں ہے۔ علانیہ بہ سر مجمع عام زبان پر لایا۔ یہ خبر جیسے ہی مشہور ہوئی اور ربیوں کے دارالقضا میں جو بیشدین کہلاتا ہے پہنچی تو اُس کے دو رکنوں نے دارالقضا کی جانب سے آکے اُسے ڈرایا دھمکایا اور کہا اگر یہ گناہ تم سے پھر کبھی سرزد ہوا تو تم ہمارے معبد اور ہماری جماعت سے نکال دیئے جاؤ گے اور جو شخص تمہیں قتل کرڈالے وہ سزاوار تحسین تسلیم کیا جائیگا سبا تائی بھلا ایسی دھمکیوں میں کب آنے والا تھا؟ کہا" مجھے خدائے اسرائیل نے اپنا مخصوص پیغمبر بنایا ہے۔ اور مجھے خاص طور پر اپنے جلالی نام کے زبان پر لانے کا مجاز کیا ہے" ربیوں نے جب دیکھا کہ وہ اپنے افعال سے باز نہیں آتا تو اُسے اپنی جماعت سے خارج کر کے فتوے دیدیا کہ یہ شخص واجب القتل ہے اپنے وطن سمرنا میں ناکامی کے آثار نظر آئے تو وہ یورپین ٹرکی کے شہر سلونکا میں پہنچا۔ جہاں یہود کی بہت زیادہ آبادی ہے۔ یہاں اُس نے کسی قدر

کامیابی کے ساتھ اپنے جدید مذہب کو پھیلایا۔ یکے بعد دیگرے دو خوبصورت یہودیہ عورتوں سے نکاح کیا اور انہیں کسی بدمزگی پر طلاق بھی دیدی پھر سلونکا سے ملک یونان میں گیا۔ وہاں سے اٹلی کی راہ لی۔ اور شہر لیگھورن میں ایک تیسری یہودیہ عورت سے نکاح کیا۔ اس کے بعد اپنے خیالات کی تلقین و تبلیغ کرتا اور طرابلس الغرب اور شام ہوتا ہوا بیت المقدس میں آیا۔ یہاں آتے ہی دعوی کیا کہ میں شریعت موسوی کا مجدد ہوں اور تموز کا روزہ جو یہود میں مروج تھا۔ اُسے موقوف کردیا۔

چند روز بعد اُس سے ناتھن نام ایک یہودی سے ملاقات ہوئی جسے ہم مذاق پاکے اُس نے اپنے راز میں شریک کیا۔ اور اب یہ دونوں اپنی متحدہ کوششوں سے ایک نیا مذہب قائم کرنے میں مصروف ہوئے چنانچہ اس قابل شخص ناتھن نے جسمیں سباتائی ہی کی ایسی جودت طبع تھی مسیح سے پہلے آنے والے پیشرو کی خدمت اپنے ذمے لی۔ اور اُس سے جُدا ہوکے ہر طرف منادی کرنے لگا کہ مسیح کے آنے کا وقت آگیا۔ اور دُولھا تم ہی میں موجود ہے" وہ لوگوں سے کہتا تھا۔ سنو۔ اب تم شریعت کے ناگوار احکام سے آزاد ہو جاؤ گے۔ اطمینان اور جوش مسرت سے اُسکا استقبال کرو"۔ ان دنوں ایک اخلاقی اور مذہبی انقلاب کی طرف عام لوگوں کے دل مائل ہو رہے تھے۔ اور ۱۶۶۶ء میں اہم اور عظیم الشان واقعات پیش آنے کی بابت بہت سی پیشین گوئیاں چلی آتی تھیں لہذا بہت سے جاہل اور متعصب لوگ اس مذہب کے پیرو ہوگئے۔ اور ناتھن کو اپنے اغراض میں کامیابی کی صورت نظر آنے لگی۔

دوسری طرف خود سباتائی کو جو شہر غزہ میں اپنے دین کی منادی کر رہا تھا۔ نمایاں کامیابی ہوئی۔ اور اُس قرب و جوار کے یہودی بخوشی اس مذہب

کی غلامی چھوٹنے اور آل اسرائیل کے حسبِ دلخواہ اوج و عروج کے شوق میں اپنے معیشت کے مشاغل کو چھوڑ کے زہد و تقوی میں مصروف ہو گئے۔ اور بڑی بڑی فیاضیاں دکھانے لگے۔ یہاں کے یہودنے قلمروِ عثمانیہ کے اور مقامات کے یہود کو مطلع کیا کہ وہ مسیح جسکا مدت سے انتظار چلا آتا تھا۔ آخر نمودار ہوا۔ اور ہم لوگوں میں موجود ہے ارضِ شام کے یہودنے جو اس جوش و خروش سے اُس کے دعوی کو قبول کیا تو اُس کا حوصلہ بڑھا۔ اور اب بڑی شان و شوکت سے وہ اپنے وطن سمرنا میں داخل ہوا اور خاص قسطنطنیہ کے یہودیوں کو بھی اپنی طرف مائل کیا۔ ناتھن ان دنوں دمشق میں تھا۔ وہاں سے اُس نے سباتائی کو ایک خط لکھا جسمیں اُسے "احکم الحاکمین" اور "خدائے یعقوب کا مسیحا" تسلیم کیا۔ حلب کے یہودیوں کے پاس بھی اُس نے ہدایت نامے بھیجے جن کے ذریعے سے اُس نے لوگوں کو اپنے دعوؤں اور مسیح جدید کے اصول سے مطلع کیا۔ اب سلطنت عثمانیہ میں ہر جگہ اور ہر شہر کے یہودی مسیح کے ظہور پر حد سے گزری ہوئی خوشیاں اور مجنونانہ مسرتیں ظاہر کرنے لگے۔ بعض شہروں میں یہود کو طفلانہ مزاجی کی خوشیوں میں غرق اور آپے سے باہر دیکھ کے مسلمانوں اور عیسائیوں کو تعجب ہوتا تھا۔ بنی اسرائیل میں ایسا عجیب و غریب جوش نظر آتا تھا۔ کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ اور اس نئے مسیح کی مسیحیت پر ایمان لانے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ بعض شہروں میں تجارت کا کاروبار بالکل رُک گیا۔ اور تمام بازار بند ہو گئے۔ یہودیوں نے اس شوق میں کہ غلامی سے انھیں نجات ملے گی اور مسیح موعود انھیں ساتھ لے کے بیت المقدس میں داخل ہوگا۔ اپنے معاملات دُنیوی بگاڑ دیئے اور منافع تجارت سے دست بردار ہو گئے

یہاں تک نوبت پہنچی کہ سلطنت عثمانیہ میں دول یورپ کے جو سفیر موجود

تھے۔ اُنہیں ان کی سلطنتوں نے حکم دیا۔ کہ اس نئی مذہبی تحریک کے متعلق تحقیقات کرکے کیفیت پیش کریں۔ اور عثمانی بادشاہوں نے باب عالی میں رپورٹ کی کہ ہماری ولایتوں میں کاروبار تجارت بالکل رک گیا ہے۔ اب یہ تحریک ایک وبائی مرض کی طرح مغربی ممالک کی طرف بڑھی۔ اطالیہ۔ ہالینڈ۔ اور جرمنی کے اکثر یہودی اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ اپنی جائدادوں کو بیچ کے یا یونہیں چھوڑ کے نئے مسیح کی خدمت میں حاضر ہوجائیں۔ سب کو یقین تھا کہ اب وہ وقت آگیا ہے۔ کہ ہم ہی ساری دنیا کے مالک ہونگے۔ غرض سب جگہ تجارت و حرفت کا کاروبار رک گیا۔ اور دولتمند یہودی محتاج یہودیوں کی بسر اوقات کے متکفل ہوگئے۔ کیونکہ سب کو امید تھی۔ کہ اس قومی فیاضی کے معاوضے میں بڑی بھاری دولت ہاتھ آئے گی۔ اب اُس سے بھی زیادہ خطرناک یہ مصیبت نمودار ہوئی کہ یہودی اپنے حاکموں اور والیوں کی فرمانبرداری سے باہر ہوئے جاتے تھے۔ کیونکہ یقین تھا کہ عنقریب یہ سب ہمارے غلام اور محکوم ہونگے یہ حالت تھی اور یہ عالم ہو رہا تھا۔ کہ سباتائی اپنے وطن سمرنا میں داخل ہوا۔ اور اُس کے استقبال میں یہود نے ایسا جوش و خروش ظاہر کیا کہ سلطنت کو اندیشہ ناک نظر آتا تھا۔ بازاریوں کا تو یہ حال تھا کہ گویا وہ یہی بھول گئے تھے کہ ہم پر کسی اور کی حکومت ہے۔ لیکن مذہبی مقتداؤں اور ربیوں نے صرف مسلمانوں حکمرانوں کے خوف سے اُس کو علانیہ مسیح تسلیم کر لینے میں تامل کیا۔ اور اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے۔ کہ آیا سباتائی کو مسیح موعود تسلیم کیا جائے یا نہیں۔ سب سے بڑے ربی نے جو خاخم باشی کہلاتا ہے۔ اُسے مشورہ کرنے کے پہلے اپنی صحبت میں بلایا۔ سباتائی فوراً مکان پر چلا آیا۔ اور اُس کے ہمراہ ایمان لانے والوں کا ایک گروہ بھی آیا جو مکان کے باہر ٹھہرا رہا۔ سباتائی کو ربی مذکور کے

گھر سے نکلنے میں زیادہ دیر ہوئی تو اُن لوگوں کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی اور خیال کیا کہ شاید ربّی نے اُسے زبردستی اپنے مکان میں بند کر رکھا ہے۔ فوراً قاضی شہر کی عدالت میں پہنچے اور کہا "ہمارے مسیح کی رہائی کا فوراً بندوبست کیا جائے۔ ورنہ ہم لوگ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے" کہا جاتا ہے کہ قاضی نے دونوں جانب سے رشوتیں لیں۔ اور آخر اس جھگڑے کا انفصال ربّیوں ہی کے محکمہ دار القضاء پر محول کر دیا۔ ربّی لوگ اُس کے ساتھ کچھ نہ کچھ بدسلوکی ضرور کرتے مگر نہ کر سکے اس لئے کہ سباتائی کی حمایت کرنیوالی جماعت اس قدر غالب تھی کہ ان کا کچھ زور نہ چلا۔ اور مجبوراً اُسے چھوڑتے ہی بنی۔

تاہم ربّیوں نے اُس کے خلاف سازش کا ایک جال قسطنطینہ تک پھیلا دیا۔ جسکا یہ نتیجہ ہوا کہ یہاں سے چھوٹ کے سباتائی جب قسطنطینہ میں پہنچا۔ اور وہاں کے یہودی بھی خوش و خروش سے اُس پر ایمان لانے لگے تو وزیر اعظم نے اُسے ماخوذ کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ اس قید سے سباتائی کا اثر بجائے اس کے کہ کم ہوتا اور بڑھ گیا۔ ہر طرف سے لوگ جوق جوق اُسکی زیارت کو آنے لگے قصر ابی دوس جس میں وہ محبوس تھا۔ ایک بہت بڑی زیارت گاہ بن گیا اور مسیح کا ایک دیدار ہو جانے کے معاوضے میں حراست کرنے والے ترک سپاہیوں کو بڑی بڑی رقمیں ملنے لگیں۔

اب اس کا شہرہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اور اسی قید خانے میں بیٹھے بیٹھے وہ ایک نئے مذہب اور نئے رسوم کو منضبط کر رہا تھا۔ اپنی پیدائش کا دن منانے کے لئے خاص رسوم اور طریقے تجویز کئے۔ لوگوں کو اپنی ماں کے مقبرے کی زیارت کا حکم دیا۔ اور جو لوگ اس مقبرے کی زیارت سے شرفیاب ہوں انکے واسطے خاص قسم کے حقوق اور فضائل بتائے اسی اثنا میں اُس کے پُرجوش

پیروؤں نے یہ کارروائی کی کہ قدیم الایام سے جتنی پیشین گوئیاں چلی آتی تہیں۔ سب اُسی سے وابستہ کردین۔ اور توراۃ کے جن جملوں میں تحریف کرکے اُسکا نام شامل کیا گیا تہا۔ وہ قطعات کے طرز پر چوکھٹوں میں لگاکے یا اور طریقوں سے لکھہ کے یہود کے معابدوں پر آویزاں کیے گئے۔

انھیں دنوں اتفاق سے نحمیا کوہن نام ایک اور شخص ظاہر ہوا جس نے سباتائی سے خواہش کی کہ اپنی مسیحیت میں مجھے بھی شامل کیجیے۔ سباتائی نے اس سے قطعًا انکار کیا اور نحمیا نے اس کا انتقام یوں لیا۔ کہ اُس کی شکایت لے کے وزرائے سلطانی کے پاس پہنچا اور کہا «اگر یہ جعلی مسیح فورًا پامال نہ کر دیا گیا تو سلطنت کے امن وامان میں خلل پڑجائے گا۔ اور ایسی بدنظمی ہوگی کہ ملک کا سنبھالنا مشکل ہوگا۔

آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ سلطان محمد رابع نے سباتائی کو اپنے سامنے بلوایا۔ اور حبیب آدریانہ (ایڈریانوپل) کے قصر شاہی تخت کے آگے حاضر کیا گیا۔ تو سلطان نے پوچھا۔ تم معجزے دکھا سکتے ہو؟» اُس نے فورًا جواب دیا «بے شک دکھا سکتا ہوں»۔ سلطان نے کہا «اچھا تو میں تمھیں اپنے تیراندازوں کا نشانہ بناتا ہوں۔ اُن کے تیروں سے اگر تمھیں کوئی صدمہ نہ پہنچا۔ تو تم بے شک مسیح ہو»۔ یہ فیصلہ سُن کے سباتائی بہت گھبرایا۔ دل میں خیال کیا کہ «اب دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ترکوں کے تیروں کا نشانہ بن کے جان دوں۔ اور یا میں اسلام قبول کرکے جان بچاؤں»۔ جب اور کوئی مفر نہ نظر آیا تو آخری صورت قبول کی۔ اور سلطان کے سامنے عرض کیا «ان تمام کوششوں سے میرا اصلی مقصود یہ تھا۔ کہ لوگوں کو خدا کی توحید۔ اور محمد رسول اللہ صلعم کی نبوت کیطرف بلاؤں۔ اور کلمۂ «لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ» کو اُن کا شعار بنادوں اس عقیدے کو اس وقت

تک جو میں نے ظاہر نہیں کیا۔ اس کا یہ سبب تھا۔ کہ چاہتا تھا۔ خاص دربار سلطانی میں اور حضرت ظل سبحانی کے سامنے کلمۂ توحید کا اعتراف کروں "

اُس کی زبان سے یہ کلمات سنتے ہی اُس کے پیرو متحیر ہو کے ایک سناٹے میں آ گئے۔ اور جتنے یہودی و مسلمان دربار میں موجود تھے۔ سب نے ایک قہقہہ لگایا۔ اکثر معتقدین منحرف ہو گئے۔ لیکن بعض سادہ لوح عقیدت کیشوں نے اب بھی اُس کی پیروی نہیں چھوڑی بلکہ خود سباتائی ہی کی طرح یہ طرزِ عمل اختیار کر لیا۔ کہ ظاہر میں تو یہودیوں کی آزار رسانی سے بچنے کے لئے عام خیالات کے یہودی بن گئے۔ مگر دل میں معترف و معتقد تھے۔ کہ سباتائی کا دین خدا کا بھیجا ہوا دین ہے۔

سباتائی کو اس کے بعد سلطان کے دربار میں حاضر رہنے کی اجازت دے گئی جہاں وہ شیخ الاسلام کے قدموں کے پاس بیٹھا نظر آیا کرتا۔ اُنطوان گلان جس نے سب سے پہلے الف لیلہ کا ترجمہ یورپ کی زبانوں میں کیا ۱۶۷۰ء میں قسطنطنیہ میں موجود تھا۔ اُس نے سباتائی کے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات اپنے روزنامچے میں درج کئے ہیں۔ سباتائی کا انجام تاریخی طور پر صرف اسی قدر معلوم ہو سکا ہے۔ کہ ۱۶۷۶ء میں بلغراد کے قید خانے میں مر گیا۔ اگرچہ اُسکے پیروؤں میں عجیب عجیب اختلاف پڑے ہوئے ہیں۔

سباتائی نے اگرچہ ایسی کمزوری دکھائی۔ اور دربار سلطانی میں ذلیل ہونے کے بعد نہایت گم نامی کی حالت میں مرا مگر اُس کے پیرو اور معتقدین بعد بھی ویسے ہی راسخ العقیدہ رہے۔ جیسے کہ اُس کی زندگی میں تھے۔ اور اپنے آپ کو امینی (مومن) کے معزز و محترم لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اور اُن کا عقیدہ ہے کہ ہمارا مسیح برحق دراصل مرا نہیں بلکہ اسی دنیاوی جسم کے ساتھ آسمان پر چلا گیا۔ سلونکا میں آجکل بھی اُن کے مخفی معبد موجود ہیں۔ جو "کل" کہلاتے ہیں اور

اُن میں وہ پوشیدہ طور پر جا کے اپنے رسوم مذہبی بجالاتے ہیں لوگوں کا بیان ہے۔ کہ ہر ایک "کل" میں ہر وقت ایک بچھونا تیار رہتا ہے۔ تاکہ اُن کا مسیح اپنے دوسرے ظہور کے وقت تھکا ماندہ آئے تو آتے ہی اُس پر لیٹ کے آرام کرے ان میں یہ بھی مشہور ہے۔ کہ ہمارے مسیح سباتائی شہر کے شمالی پھاٹک سے جو باب دردر" کہلاتا ہے۔ داخل ہونگے۔ یہ خیال یا تو اس سبب سے پیدا ہوا ہے۔ کہ سباتائی نے شہر بلغراد میں دنیا کو چھوڑا جو یہاں سے شمال جانب ہے۔ یا شاید اس بنیاد پر ہو کہ پچھلی مرتبہ جب وہ سلونکا سے گیا ہے۔ تو اُسی پھاٹک سے نکل کے گیا تھا۔ بہرحال لوگوں کو بلغراد ہی کی طرف سے اُس کے آنیکا یقین اور انتظار ہے۔ چنانچہ دو صدیوں سے یہ معمول چلا آتا ہے۔ کہ ہر روز طلوع آفتاب کے وقت ایک دو دن مہ مسیح کے استقبال کے لئے "باب دردر" سے باہر نکل کے شمالی سڑک پر کھڑا ہوتا ہے۔ تاکہ وہ آئیں تو انہیں تعظیم و تکریم سے شہر میں لائے۔ لیکن جب سے کہ سلونکا اور بلغراد کے مابین ریلوے لائن کھل گئی ہے اس وقت سے یہ بحث پیدا ہوئی کہ ممکن ہے۔ حضرت مسیح ریل پر بیٹھ کے تشریف لائیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب سالونکا کے اسٹیشن پر شمال کی طرف سے ہر ٹرین کے پہنچنے کے وقت ایک دو دن مہ ضرور موجود رہتا ہے۔ اور اپنے اُس مسیح کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ڈھونڈتا ہے۔ جس کے ورود کے ساتھ ہی اُس کی قوم ساری زمین کی مالک ہو جائے گی۔ دولت عثمانیہ میں سباتائی سیوی کے پیرووں کا مرکز و مستقر یہی شہر سلونکا ہے۔ جس میں ان کی تعداد تقریباً آٹھ ہزار نفوس کی ہے۔

اگرچہ اس مذہب کے ماننے والوں کا شمار زیادہ نہیں لیکن اس کمی پر بھی دو دن مہ لوگوں کے تین فرقے ہو گئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنی

مخفی عبادتوں میں دوسرے فرقہ والوں کو نہیں شریک ہونے دیتا۔ مگر باوجود اس اختلاف کے ہمارے سنی شیعوں سے بہت اچھے اور سمجھدار ہیں۔ کیونکہ دنیاوی معاشرت میں تینوں فریق۔ ملے جلے رہتے ہیں۔ اور باہم ایک دوسرے سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ تینوں فرقوں میں پہلا اور خاص فرقہ۔ اسمیرلی،، ہے۔ یہ لوگ گویا سباتائی کے آرتھوڈاکس تبعیں ہیں۔ ان کی پہچان یہ ہے۔ کہ ڈاڑھیاں منڈاتے ہیں اور چلبی،، یا شریف کے لقب سے مخاطب کئے جاتے ہیں۔ انہیں یہ بھی امتیاز حاصل ہے۔ کہ جو یہودی خاندان ملک ہسپانیہ سے جلاوطن ہو کے دولت عثمانیہ میں آئے اور بسے اُن میں سے جو خاندان معزز تھے یہ اُن کی نسل میں خیال کئے جاتے ہیں۔ دوسرا فرقہ یعقوبی،، کہلاتا ہے۔ یہ لوگ بالتخصیص،، یعقوبوس قےرری دو،، نام ایک شخص کے متبع ہیں جس نے دعوےٰ کیا تھا۔ کہ میں سباتائی کا بیٹا اور وارث و جانشین ہوں۔ مگر راسخ العقیدہ دونمہ لوگوں نے اُس کے دعوے کو جھوٹ ثابت کیا۔ اور اُس کی تردید کی۔

تیسرا اور سب سے چھوٹا فرقہ عثمان بابا،، نام ایک شخص کا پیرو ہے۔ جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں تھا۔ اُس شخص نے کوشش کی تھی کہ اسمیرلی اور یعقوبی،، فرقوں کو ملا کے ایک کردے۔ لیکن اس کوشش سے بجائے اس کے کہ دونوں مذکورہ فرقے مل کے ایک ہو جائیں ایک تیسرا فرقہ پیدا ہو گیا۔ اس فرقہ والوں کی وضع اور پہچان یہ ہے۔ کہ نہ ٹھڈیاں منڈواتے ہیں اور نہ سر منڈواتے ہیں ان فرقوں میں لغو اور بیہودہ قسم کے اختلافات ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک تو دستہ دار کٹورے میں پانی پینا لازمی سمجھتا ہے۔ اور دوسرا بغیر دستہ کے کٹورے میں۔ کچھ مخفی اور خاص قسم کی نشانیاں بھی ہر فرقے کی ہیں جو غیروں کو تو لغو و بے نتیجہ معلوم ہوتی ہیں مگر ان میں باہمی امتیاز ضرور ہو جاتا ہے۔

دونمہ لوگ سلونکا کی دیگر جماعتوں کے مقابل نہایت معزز اہل ہنر اور دولتمند ہیں۔ لوگوں میں مثل کی طرح مشہور ہے۔ کہ "دونمہ میں محتاج کوئی نہیں ہے" ان کے دولتمند اپنے ہم مذہب غریبوں بیوؤں اور یتیموں کی دستگیری وہمدردی عجیب صلاحیت کے ساتھ اور باضابطہ طریقے سے کرتے ہیں۔ اُن کے مکانات وسط شہر میں ایک ہی حلقے کے اندر اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں جن میں اندر ہی آمد رفت کے لئے کھڑکیاں اور دروازے لگے ہوئے ہیں۔ اور انہیں پوشیدہ راستوں سے وہ اپنے مخفی معبدوں میں بھی جاتے اور پوشیدہ صحبت ہائے عبادت میں شریک ہوتے ہیں۔

ان کی زندگی کا اصلی اسلوب یہ ہے۔ کہ ظاہر میں ترک اور مسلمان مگر باطن میں یہودی۔ اس لئے کہ خود سباتائی نے تقیۃً اپنے آپ کو سلطان کے سامنے مسلمان ظاہر کیا۔ اور باطن میں یہودی رہا۔ چنانچہ وضع ولباس کی یکسانی کے علاوہ ان کی عورتیں بھی مسلمان خواتین کی طرح پردہ کرتی ہیں۔ اگرچہ بعض موقعوں پر وہ مسلمان عورتوں سے زیادہ بے باک و آزاد نظر آتی ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے۔ کہ دولت عثمانیہ کی تمام قوموں کے خلاف دونمہ لوگ، دوسری قوموں میں شادی بیاہ کرنے کے نہایت ہی خلاف ہیں۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک ترک مسلمان کا دونمہ قوم کی ایک لڑکی پر بے اختیار دل آگیا اور یہاں تک درپے ہوا کہ وہ لڑکی بھی شادی کرنے پر راضی ہوگئی۔ لیکن لڑکی کے احباب اور عزیز اس تعلق کے اس قدر خلاف تھے کہ جب کوئی اور تدبیر نہ بنی تو اُس ترک کو چار ہزار پونڈ (ساٹھ ہزار روپیہ) بطور نذرانہ دے کے نکاح کے ارادے سے باز رکھا۔ دونمہ لڑکی اگر کسی قوم والے کے ساتھ نکل جائے تو پہلے اُس کے واپس بلانے میں کوئی تدبیر اور کوشش نہیں اٹھا رکھی جاتی

اور جب وہ ہاتھ آ جاتی ہے۔ تو ایک مخفی قومی عدالت کے سامنے اُس کا مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ جس میں وہ ملزم ٹھہرائی جاتی ہے۔ اور ارتکاب جرم کی سزا میں اندر ہی اندر قتل کر ڈالی جاتی ہے۔

معاشرت کے علاوہ مذہبی حیثیت سے بھی ان لوگوں کی یہی حالت ہے۔ کہ بظاہر اپنے آپ کو مُسلمان دکھانا چاہتے ہیں۔ مگر سب سے چھپا کے بعض ایسے رسوم بجا لاتے ہیں۔ جو نہ مسلمانوں سے علاقہ رکھتے ہیں نہ یہود سے۔ اُن کے تمام تاجر جمعہ کے دن دُکانیں اور کاروبار بند کر دیتے ہیں جمعہ کو کبھی کبھی جامع مسجد میں عیدین کو عیدگاہ میں بھی آ کے شریک نماز ہوتے ہیں۔ اُن کے مخصوص قومی اور مخفی عبادت خانوں کی نسبت لوگوں کا بیان ہے۔ کہ ان میں کھڑکیاں یا دروازے نہیں رکھے جاتے۔ اور ان کے اندر سبز رنگ کی لالٹینیں روشن کی جاتی ہیں۔ عبادت اُس اندلسی زبان میں کرتے ہیں۔ جو دولت عثمانیہ کے یہود کی قومی زبان ہے۔ بعض موقعوں پر قربانی بھی کرتے ہیں۔ اور اُس کے خون کے ٹیکے اپنے دروازوں کے ٹپاؤ اور بچوں کی پیشانیوں پر لگاتے ہیں۔

یہ بھی مشہور ہے۔ کہ ان میں بعض مخفی صحبتیں بھی ہوتی ہیں۔ جن میں وہ ہر قسم کی بداخلاقی اور بدکاری میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ اور گو یہ امر مسلمانوں عیسائیوں اور یہودیوں میں عام طور پر مشہور ہے۔ مگر کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس لئے دنیا کے جتنے گروہوں نے اپنی مذہبی رسموں کے مخفی طور پر بجا لانے کی کوشش کی ہے۔ اُن سب پر یہی تہمت لگائی گئی ہے۔

تمام صوفیہ مشرق کے اصول کے مطابق ان کا کام اعتقاد یہ ہے۔ کہ پیغمبر حضرت رب العزت کے مظہر ہو سکتے ہیں۔ اور حضرت آدم [illegible]

جناب رسالت مآب صلعم تک جتنے نبی گزرے سب اسی ہستی مطلق کے مظہر تھے۔ اُن کے ۱۶ احکام جو اُن کے عقائد کے جامع اور گویا اُن کا ایمان مفصل ہیں حسب ذیل ہیں :۔

(۱) میں خدا کی توحید اور سبا تائی سیوی کے مسیحا ہونے پر ایمان رکھتا ہوں۔ اور یقین کرتا ہوں کہ آدم۔ ابراہیم۔ یعقوب۔ موسیٰ۔ استیر۔ اور دیگر انبیائے تورۃ سب اُسی مسیحا کے روح کے اجزا تھے جو اٹھارہ مظاہر میں نمایاں ہو چکا ہے۔

(۲) ساری دنیا ماینی لوگوں (پیروان سبا تائی) کے لئے ہے اور ترک صرف اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ اُن کی حفاظت کریں۔ اُن کا مقولہ ہے۔ کہ کوئی انڈا بغیر چھلکے کے نہیں ہوتا۔ اسی طرح ماینی لوگ اصل انڈا اور ترک اُس کا چھلکا (کلیپہ) ہیں۔

(۳) تمام لوگ جو یہودی نہیں کلیپہ (انڈے کے چھلکے) ہیں

(۴) ماینی کے لئے نہ یہودیوں میں شادی بیاہ کرنا جائز ہے اور نہ کلیپہ میں

(۵) جنت کی بادشاہی کے وارث صرف ماینی لوگ ہوں گے

(۶) کلیپہ مرنے کے بعد جہنم میں جائیں گے اور وہیں رہیں گے

(۷) تمام یہود جو ابھی تک ماینی نہیں ہیں اُس وقت ایمان لے آئینگے۔ جب اُن کی آنکھیں کھلیں گی اور یہ حقیقت نظر آئے گی کہ موسیٰ اور دیگر انبیا سبا تائی ہی کی روح کی چنگاریاں تھیں۔

(۸) تمام معاملات میں شریعت موسوی کی پیروی کرنی چاہیئے۔

(۹) یہود سے نفرت نہ کرنی چاہیئے بلکہ ان کی استمالت کی جائے اس لئے کہ ان کی نسبت ازل سے لکھا گیا ہے۔ کہ ہمارے بھائی ہو جائیں گے۔

(۱۰) یہود کے اپنے دین میں لانے کی ہمیں کوشش نہ کرنی چاہیئے اس لئے کہ خدا خود ہی انھیں عالم آخرت کا راستہ بتائے گا۔

(۱۱) ہمیں بظاہر مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ لیکن دلوں میں اسرائیلی رہنا چاہیئے۔

(۱۲) جو ماہینی ان توانین کو توڑ ڈالے اُس کے قتل کو خدا کی نظر میں گناہ نہ خیال کرنا چاہیئے۔

(۱۳) تمام ماہینی لوگوں کے لئے لازم ہے۔ کہ دنیوی حیثیت سے شریعت اسلامیہ کی پیروی کریں۔ مگر وہ اپنے مقدمات ترکی عدالت کے سامنے ہرگز نہ لے جائیں بلکہ اُن کا فیصلہ خود اُن کی جماعت کے ارکان کریں۔ اور گو ترکون کی رعایا ہون مگر بے ضرورت اپنے آپ کو ان کے سامنے حقیر نہ کریں۔

(۱۴) نشہ کرنے والے عرقوں سے پرہیز کریں۔

(۱۵) اپنے دو نام رکھا کریں۔ ایک ترکی دنیوی معاملات کے لئے اور ایک قومی جو صرف اپنی جماعت والون کو معلوم ہو۔

(۱۶) اُعلئے "قومون" (غالباً پیغمبرون) کے نام ہر روز دن بھر میں دو دفعہ زبان سے ضرور ادا کیا کریں۔

دونمہ لوگوں کا بیان توختم ہو چکا۔ مگر سلونکا ہی میں یہود کا ایک اور گروہ بھی موجود ہے۔ جس نے مسلمانون کے اصول و اخلاق اختیار کر لئے ہیں اس گروہ والوں پر اکثر دونمہ لوگون کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ مگر وہ حقیقت میں دونمہ نہیں ہیں۔ اُن کی اصلیت صرف اس قدر ہے۔ کہ تقریباً ڈیڑھ ہونے دو سو برس گزرے سلونکا کے چند یہودی مہاجن پاشا یا والی کے اجلاس میں واجب القتل قرار پائے تھے۔ مگر اظہار اسلام کر کے انھوں نے

اپنی جان اور جائداد بچالی۔ تقریباً تیس یہودی خاندانوں نے اُس زمانے میں مذہب اسلام قبول کیا تھا۔ اب ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے ڈیڑھ سو خاندانوں تک پہنچ گئی جن کا مسلک یہ ہے۔ کہ بظاہر مسلمان ہیں اور باطن میں یہودی رسوم مذہبی کو بجالاتے ہیں۔

حاتم طائی

یہ عجیب وغریب بات ہے۔ کہ جن لوگوں کے نام شب و روز ہماری زبان پر رہتے ہیں اُن کے حالات سے واقف ہونا درکنار ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ تھے کون ہر قسم کی سوسائٹی اور ہر زبان کے عام محاورات میں چند ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کا نام کسی خاص صفت کے موقع پر ہر خاص وعام کی زبان سے سنا جاتا ہے اور ہر بچہ بھی اُن ناموں کو اُن اوصاف کا ہیرو خیال کرتا ہے جن کے اظہار کے لئے وہ نام بار بار لئے جاتے ہیں۔ دیکھو جب عشق کا تذکرہ ہوگا۔ مجنون عامری کا نام کسی نہ کسی پہلو سے یاد ہی آجائیگا۔ حسن کی تعریف کیجاتی ہوگی تو ممکن نہیں یوسف صدیق کا معجز نما حسن نہ پیش کردیا جائے۔ اور اسی طرح جب سخاوت کا تذکرہ چھڑیگا تو حاتم کا نام خواہ مخواہ کسی نہ کسی کی زبان سے نکل ہی جائیگا۔ ایسے لوگوں کو عموماً قومیں اور بڑی بڑی سوسائٹیاں اُن اوصاف کا مظہر کمال تسلیم کرتی ہیں جن کے ساتھ کہ اُن کے نام کو مناسبت ہے۔ اسی قسم کے لوگ اگلی قوموں میں خاص اوصاف کے دیوتا مانے جاتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہمارا مذاق توحید نے بدل نہ دیا ہوتا تو اس قسم کے اُن لوگوں کو جو ہماری سوسائٹی میں کسی خاص صفت کے ساتھ مشہور رہیں ہم بھی دیوتا ہی مانتے

مگر حیرت کی یہ بات ہے۔ کہ اس قسم کے وہ لوگ جو ہماری سوسائٹی میں مشہور

ہیں اُن کی شہرت تو اس قدر ہے کہ شاید دنیا سے اسلام کا کوئی بچہ بھی اُن کے نام سے ناواقف نہ ہوگا لیکن یہ کتنے بڑے غضب کی بات ہے کہ ان میں سے شاید ایک ہی آدھ ایسا خوش نصیب ہوگا جسکے حالات زندگی سے ہمیں کسی قدر واقفیت ہو کئی موقع پہ ہم عنبل عامری کے حالات پر سے لاعلمی کا پردہ اٹھا چکے ہیں اور آج ہمیں حاتم طائی کا نام یاد آیا ہے جس غریب کے سوانحعمری قیس سے کہیں زیادہ تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔ حاتم طائی کا ایک قصہ اُردو کی سوسائٹیوں میں شایع ہے جو اپنے مقام پر ایک چھوٹی سی داستان امیر حمزہ ہے۔ اُن حالات کے خلاف نیچر اور بالکل مہمل و بے سروپا ہونے کے علاوہ قیامت تو یہ کیگئی ہے۔ کہ اس قصہ میں حاتم کی حالت اور اُسکے کیرکٹر کا بھی پتہ نہیں لگتا۔ رومیوں اور یونانیوں نے اپنے دیوتاؤں کی متھالوجی (دیو بانی) بیان کرنے میں افترا بندی کا وہ کمال نہ دکھایا ہوگا جو مسلمانوں نے حاتم کے حالات بیان کرنے میں دکھادیا ہے۔ بہر تقدیر ہمیں افسوس ہے کہ حاتم کا ایسا نامور شخص اور اس کے اصلی حالات یوں لاعلمی کے پردے میں چھپے ہوئے ہوں اور اسی وجہ سے آج ہم حاتم طائی کے وہ حالات بیان کرتے ہیں جو واقعی ہیں اور جن کے جاننے کی لوگوں کو ضرورت ہے جاہلیت میں چار آدمی ایسے تھے جن سے زیادہ فیاضی کا اظہار اور کسی شخص سے نہین ہوا۔ حاتمؓ بن عبداللہ طائی۔ ہرمؓ بن سنان۔ خالدؓ بن عبادہ۔ اور کعب بن مامۃ الایادی۔ اگرچہ ان چاروں کی فیاضیوں کی دھوم تھی۔ مگر حاتم اور کعب ایسے تھے کہ جود وسخا میں ضرب المثل قرار پاگئے۔ اور گھروں کی بیٹھنے والیاں تک ان کو مجسم فیاضی خیال کرتی تھیں۔ خاصتہً حاتم طائی کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ تو شاید دنیا میں کسی کو بہت کم نصیب ہوئی ہوگی۔ کعب کا واقعہ تو یہ ہے کہ ایکمرتبہ سفر میں پیاس کی شدت تھی اور اس قدر شدت کہ دم نکلا جاتا تھا۔ ایک دوست بھی ساتھ تھا جسکی بھی یہی حالت ہو رہی تھی۔ اتفاقاً اتنا پانی ایک مقام پر مل گیا

جس سے ایک شخص پیاس بجھا سکے کعب نے وہ پانی تو اپنے دوست کو پلا دیا اور خود اُسی تشنگی میں تڑپ تڑپ کے جان دی۔ اسمیں شک نہیں کہ کعب نے ایسے موقع پر فیاضی کا ثبوت دیا جسوقت شاید کسی سے نہ ہو سکتا۔ لیکن چونکہ اسکی زندگی کا صرف ایک ہی واقعہ معلوم تھا لہذا اہل عرب میں اُسکے نام کی اتنی شہرت نہیں ہوئی جتنی کہ حاتم کے نام کی۔

حاتم طائی کا نام سارے عرب میں اسقدر ہر دلعزیز تھا کہ ہم قیاس کرتے ہیں۔ شاید اُسکے حالات بیان کرنے میں بھی کسیقدر مبالغہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ اُسکی فیاضی کا ایک ایسا نمونہ بتایا جاتا ہے جو بالکل خلاف قیاس ہے۔ عموماً عرب کہتے ہیں کہ جب حاتم مرا تو لوگوں نے تجویز کی کہ اُسکے بھائی کو سرداری فوج کے لئے منتخب کریں۔ حاتم اور اُس خلیفہ ہونے والے بھائی کی غمزدہ ماں ہنوز زندہ تھی۔ یہ تجویز سُن کے بہت بگڑی اور کہا "بھلا اسکو (دوسرے بھائی کو) حاتم سے کیا نسبت ہے جو اُسکے مقام پر بٹھایا جائے۔ خدا کی قسم حاتم جب پیدا ہوا ہے تو اُس نے سات دن تک کسی طرح دودھ نہیں پیا۔ جب میں نے ایک پڑوس کے غریب بچے کو دودھ پلا لیا تب اُس نے دودھ پینا شروع کیا۔ اور اُسکا (دوسرے بھائی کا) یہ حال تھا کہ ایک طرف تو دودھ پیتا تھا اور دوسری چھاتی پر ہاتھ رکھے رہتا تھا کہ کوئی اور نہ پی جائے۔

عہد جاہلیت میں اہل عرب میں تاریخ نہ تھی اور نہ انکے وہاں کوئی سلسلہ تاریخ نگاری کا تھا۔ اسی وجہ سے اُس زمانہ کے لوگوں کی تاریخ ولادت و وفات کا پتہ لگانا محال ہے۔ جاہلیت کی لڑائیاں جو ایام عرب کے نام سے نامزد ہیں اُنکے مختصر حالات تو معلوم ہو جاتے ہیں مگر اُن میں سے ایک کے متعلق بھی یہ پتہ مشکل سے لگتا ہے کہ کس تاریخ اور کس سنہ میں ہوئی۔ لہذا ہم نہیں بتا سکتے کہ حاتم کس دن پیدا ہوا اور کب مرا۔ مگر ہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کے مبعوث ہونیسے

پہلے ہی مر چکا تھا۔ اور اُسکے بیٹے اسوقت موجود تھے جب عرب نے دین اسلام
اختیار کیا ہے۔ حاتم کے بیٹے عدی نے جب آنحضرت کی مخالفت پر آمادگی ظاہر
کی تو آپ نے حضرت علی کو مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ لڑائی ہوئی اور عدی شکست
کھاکے مع اپنے اہل و عیال کے ملک شام میں بھاگ گیا۔ اُسکی بہن سفانہ بنت
حاتم چھوٹ گئی اور اُسکے ساتھ نہ جا سکی جسکو جناب علی گرفتار کرکے مدینہ میں لائے
اور آنحضرت کے سامنے پیش کیا۔ آپ کے سامنے آتے ہی سفانہ نے کہا۔
"افسوس ابا جان کا انتقال ہوگیا۔ بھائی نے بھاگ کے اپنی جان بچائی۔ مناسب
ہو تو مجھے چھوڑ دیجئے اور مجھے ذلیل کرکے تمام قبائل عرب کو ذلیل نہ کیجئے۔ میرے
والد سردار قوم تھے اور میں حاتم طائی کی بیٹی ہوں" اسکے ساتھ ہی سفانہ نے
حاتم کے تمام اوصاف بیان کرنا شروع کئے۔ آنحضرت نے سُن کے فرمایا۔
"اے لڑکی۔ یہ سب تو خاص مُسلمانوں کے اوصاف ہیں" اسکے بعد آپ نے
صحابہ کی طرف دیکھ کے فرمایا "کوئی امیر قوم غریب ذلیل ہو جائے تو اُس کی
عزت کرو" پھر آپ نے سفانہ کے چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ اور اس پر بہت کچھ احسان
کیا۔ سفانہ نے عرض کیا مجھے اتنی اجازت دیجئے کہ آپ کے حق میں چند دعائیہ
کلمات کہوں۔ آپ نے اجازت دی اور وہ دعائیں دیکے رخصت ہوئی اور
اپنے بھائی سے جا ملی۔ وہاں جاکے اس خوبی کے ساتھ آنحضرت کے محامد بھائی
سے بیان کئے کہ وہ دونوں بھائی بہن مع اہل و عیال کے حاضر ہوئے۔ اور
صدق دل سے ایمان لائے۔ سفانہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ بھی فیاضی میں بالکل
اپنے باپ پر پڑی تھی۔ حاتم اپنے اونٹوں میں سے چند اونٹ اُس کو
دیتا تھا اور وہ ہمیشہ غریبوں کو دیدیا کرتی تھی۔ آخر یہ رنگ دیکھ کے ایک
روز حاتم نے کہا "بیٹی" مال و دولت پر جب دو سخی جمع ہو جائینگے تو اُسے تباہ

کر دیں گے۔ یا تو تم سخی رہو اور میں بخیل نبوں اور یا میں سخی رہوں اور تم بخیل ہو جاؤ"
اسکے جواب میں سفانہ نے کہا "ابا جان میں نے یہ عمدہ اخلاق آخر آپ ہی سے تو
سیکھے ہیں"۔ خیر حاتم کی اس نصیحت پر سفانہ تو فطرۃً عمل نہ کر سکتی تھی مگر حاتم کی
بی بی اس غرض کے لئے نہایت مناسب تھی۔ جو اتنی ہی بخیل تھی جتنا وہ فیاض تھا
حاتم کی کنیت ابو سفانہ اور ابو عدی تھی۔ اور اس سے پتہ لگتا ہی کہ دونوں اولادوں
سے اُسے برابر محبت تھی۔ عرب کے معمولی بہادروں کی طرح حاتم کی زندگی بھی لوٹ
مار پر بسر ہوتی تھی۔ مگر اپنے مال غنیمت کا چوتھائی حصہ ہمیشہ لازمی طور پر غربا اور
معذورین کی نذر کر دیا کرتا تھا اُس کا شمار شعرائے جاہلیت میں ہے۔ اسکے
ساتھ بہادر اتنا بڑا تھا کہ کبھی کسی سے نہیں دبا۔ قول کا اتنا بڑا دھنی تھا کہ جو کہتا
تھا وہی کر گذرتا تھا۔ فیاض اتنا بڑا تھا کہ سائل کبھی اس سے درخواست کر کے
محروم نہ رہ سکتا تھا۔ رحم دلی اُسکے مزاج میں اسقدر تھی کہ جس کسیکو گرفتار
کرتا تھا فوراً ترس کھا کے چھوڑ دیتا تھا۔ فیاضی نے اُس قدر ہر دلعزیز
بنا دیا تھا کہ جس وادی میں جا کر پڑاؤ ڈالتا تھا فوراً اوسکا مسکن لوگوں میں
مشہور ہو جاتا تھا۔ جاڑوں کی راتوں میں اپنے غلاموں کو حکم دیتا تھا کہ جا بجا
مقامات پر آگ روشن کریں تاکہ مسافروں کو معلوم ہو اور آ کے اس کے مہمان
بنیں۔ یا کوئی راستہ بھول گیا ہو تو آگ کے پاس چلا آئے۔ ماہ رجب کی
تمام قبائل مضر میں بڑی تعظیم کی جاتی تھی۔ حاتم کا قاعدہ تھا کہ اس مہینہ میں
پہلی سے تیسویں تک ہر روز دس اونٹ ذبح کرتا تھا جن سے دور دور تک
لوگوں کی مہمانی کی جاتی تھی۔ مسافر اور محتاج کے سامنے اُسے اپنے تمام
مال و دولت میں سے کسی چیز کے ساتھ محبت نہ ہوتی تھی اور بے تکلف ہر چیز کو
دے ڈالتا تھا۔ ہاں اُسکے فیاض ہاتھ سے اگر کوئی چیز محفوظ تھی تو اُس کا

گھوڑا اور تمام سامان جنگ۔ جو دراصل اُسکی سپہگری کا زیور اور اُس کے معاش کا آلہ تھا۔

ماویہ بنت عفیر اُسکی بی بی تھی۔ ماویہ کے بھتیجے ملکان نے ایک بار اُس سے کہا کہ "پھوپھی کچھ حاتم کے حالات بیان کرو" اسپر ماویہ نے کہا کہ اور سب باتیں تو خیر ہوتی ہی رہتی تھیں مگر مجھے حاتم کے ایک واقعہ پر حیرت ہوگئی۔ ایک سال قحط پڑا تھا۔ اور ہر طرف بھوک کی ایسی شکایت پیدا ہوگئی کہ لوگ اپنے مویشیوں کو کھا کھا کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ قحط کا اثر ہم پر بھی پہنچا اور ایک دن کھانا نہ نصیب ہوا۔ دن تو جس طرح بنا کاٹ دیا۔ اب رات ہوئی۔ اور بھوک کے مارے ہم دونوں کی یہ حالت تھی کہ کسی طرح قرار نہ آتا تھا۔ اور سب سے زیادہ آفت یہ تھی کہ دونوں بچے عدی اور سفانہ بلک بلک کے رو رہے تھے۔ آخر ایک بچہ کو میں نے گود میں لیا اور ایک کو حاتم نے اُن کو بڑی مصیبتوں سے پھسلا پھسلا کے سُلایا۔ اور ہم دونوں لیٹ کے باتیں کرنے لگے یہ میں جانتی ہوں کہ حاتم کو مجھ سے زیادہ بھوک لگی تھی اور اُسکی گرسنگی پر مجھے بار بار ترس آتا تھا آخر میں نے خیال کیا کہ انکو کسی طرح نیند آجائے تو اچھا ہے۔ مگر وہ باتیں کئے جاتا تھا جن سے زیادہ تر میری دلدہی مقصود تھی۔ آخر میں مُنہ لپیٹ کے پڑ رہی تاکہ وہ چپ ہو اور خموشی میں خواہ مخواہ آنکھ لگ جائیگی۔ حاتم نے دو ایک بار مجھے پکارا مگر جب میں نہ بولی تو سمجھا کہ میں سو گئی۔ یکایک ایک آہٹ سی معلوم ہوئی کہ کوئی شخص ہمارے خیمہ میں آیا ہے۔ حاتم نے اُٹھ کے دیکھا تو ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔ پوچھا کون۔ عورت نے کہا حاتم میں تمہارے پاس دو ایسے لڑکوں کے پاس سے آئی ہوں جن کی بھوک کے مارے بہت بُری حالت ہو رہی ہے۔ یہ سُنتے ہی حاتم نے بلا تامل کہا "اچھا جاؤ اپنے بچوں کو لے آؤ" یہ جواب سُن کے عورت تو اپنے بچوں کو

لینے گئی۔ اور مجھے اسقدر حیرت تھی کہ ضبط نہ ہوسکا اور میں نے تکیہ سے سر اُٹھا کے کہا حاتم ہم خود کئی دن سے تو بھوکے پڑے ہیں تم کھلاؤ گے کیا جو اس عورت کے بچوں کو بُلایا ہے۔ حاتم نے کہا۔ "رخدا کی قسم میں تمہارے اور اُسکے دونوں کے بچوں کو کھانا کھلادوں گا" یہ کہہ کے چھری ہاتھ میں لی اور اپنے گھوڑے کو ذبح کر ڈالا۔ آگ روشن کی اور گوشت کے ٹکڑے اُس عورت کے ہاتھ میں دیکے بولا لو بھونو اور کھاؤ۔ پھر میں نے اپنے بچوں کو جگایا۔ ہم سب آگ کے گرد بیٹھے کھا رہے تھے کہ حاتم نے کہا بھئی یہ تو بڑی بے غیرتی ہے۔ ہم بیٹھے اپنا پیٹ بھر رہے ہیں اور سارا قبیلہ بھوکا پڑا ہے۔ یہ کہتے ہی اُٹھا اور قبیلہ میں ہر ہر خیمے کے دروازے پر گیا اور کہا آگ کے پاس چل کے کھانا کھاؤ۔ الغرض سارے قبیلہ نے اُس گھوڑے کے گوشت میں حصّہ لگایا۔ اور خود حاتم صرف بلانے اور مہانداری ہی میں مشغول رہا۔ میں قسم کھا سکتی ہوں کہ اُس گوشت میں سے ایک ریشہ بھی اُسکے مُنہ میں نہیں گیا۔

اُسکی بی بی ماویہ جسکی زبانی گذشتہ واقعہ بیان کیا گیا۔ اپنے ذاتی بخل کی وجہ سے حاتم کو ہمیشہ لعنت ملامت کیا کرتی تھی۔ مگر حاتم کا قاعدہ تھا کہ سُن تو سب کچھ لیتا تھا مگر کرتا وہی تھا جو اُسکی فیاضی کا مقتضیٰ ہوتا تھا جسکا نتیجہ یہ تہا کہ حاتم تو اپنی بی بی سے تنگ نہیں آیا مگر اسلئے ماویہ ہی اُسکے ہاتھوں عاجز آ گئی۔ ماویہ کو یہ شکایت پیدا ہو چلی ہی تھی کہ مالک نام اُسکے ایک ہم قبیلہ ذی ثروت نے اُس سے کہا، حاتم کے پاس پڑے پڑے گڑھنے سے فائدہ جو سب اِدھر اُدھر لٹا دیتا ہے اور تمہارے بچوں کے لئے بھی کچھ نہیں چھوڑتا۔ حاتم کو طلاق دو۔ اور مجھ سے نکاح کر لو کہ تمہارے

ملہ جاہلیت میں عورتیں بھی مردوں کو طلاق دے سکتی تھیں۔ اگر وہ اپنے شوہر کو طلاق دینا چاہیں تو اونکے لئے یہ طریقہ مقرر تھا کہ بالوں کے جن خیموں میں رہا کرتی تھیں اونکا رُخ بدل دیا کرتی تھیں

لڑکے ہمیشہ خوش رہیں۔ ماویہ نے اُسکے کہنے پر عمل کیا۔ اور حاتم ایک دن پلٹ
کے آیا تو دیکھا کہ بی بی نے خیمہ کا رُخ پلٹ دیا سمجھا کہ عمر بھر کی رفیقہ سے مفارقت
ہوئی۔ اپنے بچوں کو لیکے چلا گیا اور ایک وادی میں جاکے اُترا۔ دوسرے روز
پچاس سوار ماویہ کے خیمہ کے گرد آکے اُترے اس لئے کہ اس خیمہ کو وہ حاتم
کا خیمہ خیال کرتے تھے۔ ماویہ پریشان ہوئی کہ انکی خبر گیری کیونکر کرے۔ ماویہ
نے اپنی لونڈی کو مالک کے پاس بھیجا اور کہا کہ اس سے کہنا حاتم کے پچاس
مہمان ہمارے ہاں آکے اُتر پڑے ہیں۔ کچھ بھیجو کہ ہم اُنکی خبر گیری کریں۔ اور
تھوڑا سا دودھ بھیجو کہ اُنکو پلائیں۔ اسکے ساتھ ماویہ نے اپنی لونڈی سے کہا تو
یہ کہہ کے مالک کی صورت دیکھنا اگر وہ بخوشی خاطر اور بشاش چہرے سے یہ چیزیں
دے تو لے آنا اور اگر چین بجبین ہوکے اور برہم و منغص ہوکے دینا چاہے تو
خبردار نہ لینا اور خالی ہاتھ واپس آنا اور ہاں یہ بھی کہہ دینا کہ یہ صرف آج ہی کی
رات کے لئے ہے۔ اسلئے کہ لوگوں کو ابھی یہی خیال ہے کہ یہ حاتم کا خیمہ ہے پھر
ضرورت نہ ہوگی۔ غرض لونڈی گئی۔ اور مالک نے یہ پیام سُنتے ہی غصہ سے اپنا
سر پیٹنا شروع کیا اور ڈاڑھی نوچ کھسوٹ ڈالی۔ اور کہا ماویہ سے میرا سلام کہکے
کہنا کہ اسی لئے تو میں نے تم کو اصلاح دی تھی کہ حاتم کا ساتھ چھوڑ دو۔ اور میرے
پاس اتنا دودھ نہیں ہے جو حاتم کے مہمانوں کے لئے کافی ہوسکے۔ لونڈی جب
خالی ہاتھ واپس آئی تو ماویہ نے اُسے حاتم کے پاس روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ لوگ
جانتے ہیں یہ تمہارا خیمہ ہے اور اُس وجہ سے یہاں پچاس مہمان آگئے ہیں۔ لہذا

۱؎ یعنے جدھر دروازہ ہوتا تھا اُدھر پشت کرتی تھیں۔ اور جدھر پشت ہوتی تھی اُدھر دروازہ
کر دیتی تھیں۔ مرد یہ خیمہ کا رُخ بدلنا دیکھ کے سمجھ جاتا تھا کہ بی بی کا مزاج بدل گیا اور وہ اس
گھر سے علٰحدہ ہو جاتے تھے۔

ایک اونٹنی بھیجو کہ ذبح کرکے کھلائیں اور اتنا دودھ دو کہ اُنکو پلائیں۔ لونڈی حاتم پاس گئی اور سارا حال بیان کیا۔ حاتم فوراً دو اونٹنیاں اور بہت سا دودھ لیکے خود آیا اور اطمینان سے بیٹھ کے مہانوں کو کھلانے لگا۔ یہ حال دیکھ کے ماویہ خیمہ کے اندر سے چلائی "حاتم میں نے اسی وجہ سے تم کو طلاق دی تم مہانوں کے پیچھے دیوانے ہوئے ہو اور میرے بچے مرے جاتے ہیں اُنکی کچھ خبر نہیں لیتے" حاتم نے سُن کے کہا "ماویہ۔ یہ تمھاری غلطی ہے جس نے پیدا کیا ہے وہ سب کے رزق کا ذمہ دار ہے۔ ہمارے دینے نہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا"

حاتم کی ایک اور عجیب و غریب فیاضی مورخین کے ذریعہ سے ہم کو معلوم ہوئی ہے جو اپنی وضع پر ان سب باتوں سے زیادہ قابل حیرت ہی۔ لیکن صرف ایک اوسی قصہ سے اسکی طینت کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ ایک بار قبیلہ طے پر عرب کے کسی اور قبیلہ نے حملہ کیا۔ حاتم جو اپنی فیاضی کے برابر ہی جری اور بہادر بھی تھا اسلحہ سے آراستہ ہو کے مقابلہ کو نکلا۔ اور اس بہادری سے مقابلہ کیا کہ سب کو مار کے بھگا دیا۔ بخاصتہً دشمن کے سرگروہ کے تعاقب میں دُور تک بڑھتا چلا گیا۔ جس وقت یہ اُسکے تعاقب میں چلا جاتا تھا اُس نے پھر کے کہا "حاتم یہ اپنا نیزہ مجھے دیدو" اتنا سُنتے ہی حاتم نے اپنا نیزہ اُسکی طرف پھینکدیا اور نہتّا واپس آیا۔ حاتم کی اس کارروائی پر دشمنوں کو بھی حیرت ہوگئی جب اپنے لوگوں میں واپس آیا تو سبھوں نے الزام دیا کہ ایسی فیاضی کس کام کی۔ اور اگر وہ لوگ مار ڈالتے۔ یہ سُن کے حاتم نے کہا "ہاں یہ تو صحیح ہے۔ مگر جب کوئی کہے کہ مجھے یہ چیز دیدو تو اسکا جواب سوا اسکے اور کیا ہو سکتا تھا۔"

اِس سے صاف ظاہر ہے کہ حاتم نہیں کا لفظ جانتا ہی نہ تھا۔ اور فیاضی اُسکے رگ و ریشہ میں سرایت کرکے اسکا نیچر ہو گئی تھی۔ اور ایسے شخص کی

نسبت یہ کہنا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اُس نے بغیر دوسرے بچے کے پلائے اپنی ماں کا دودھ نہ پیا۔

بہرحال حاتم نے اگرچہ اسلام کا زمانہ نہیں پایا۔ اور مشرکین عرب میں اُسکا بھی شمار ہے۔ لیکن اُسکی فیاضی کی بنا پر اُمید ہے کہ خداوند جل علاء اُسکے دیگر گناہوں کو معاف کریگا۔

محمد بن تومرت المہدی المغربی

دنیا میں کوئی مذہب نہیں جسمیں یہ نہ بتایا گیا ہو کہ ایک دینی مقدس مقتدا آخر عہد میں پیدا ہوگا جسکی بابرکت کوششوں سے ساری دُنیا اسی دین کی پابند ہو جائے گی۔ یہ کچھ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں کہ وہ امام آخر الزماں کے منتظر ہیں۔ ہندو آتش پرست۔ یہودی عیسائی۔ سب کسی شخص کے منتظر ہیں اس میں یہ فلسفیانہ فائدہ توضرور ہے کہ انسان کبھی مایوس نہیں ہونے پاتا۔ مگر اسکے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات جو نقصان پہنچ جاتا ہے وہ کسیطرح مٹائے نہیں مٹتا۔ اگر انصاف کیجیئے تو اس قسم کی پیشینگوئی اسلام میں بہت ہی ضعیف الفاظ میں کی گئی۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ ایسی روایات کے چمکانے میں بنی امیہ بنی عباس۔ اور بنی ہاشم کی پولٹیکل مخالفتوں نے بہت مدد دی۔ مگر اب تو اہل اسلام عموماً اپنے اعتقاد میں امام مہدی کے منتظر ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن ذریعوں سے دیگر مذاہب والے کسی آنے والے ریفارمر کا انتظار کر رہے ہیں وہ ذریعہ بجائے خود مسلمانوں کی روایات سے قوی ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں خدا جانے کس بے صبری سے انتظار کیا گیا کہ جتنے مدعیان مہدویت انکی تاریخ میں نظر آتے ہیں اور کہیں نہیں نظر آتے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ملا محمود جونپوری موجود ہیں جن کے دعوے کی یادگار ہیں آجتک فرقہ مہدویہ دکن میں پورے استقلال کے ساتھ قائم ہے۔ ملا محمود جونپوری کو باوجود ہزار کوششوں کے پولٹیکل قوت نہ حاصل ہو سکی لیکن اسمیں شک نہیں کہ وہ ممالک مشرق کے زبردست اور کبھی نہ بھولنے والے مدعی مہدویت تھے۔ اب اُنکے مقابل میں ہم اُن بزرگ کو دیکھتے ہیں جنھوں نے عرض مغرب میں مہدویت کا دعویٰ کرکے سارے افریقہ اور اندلس میں ہل چل ڈالدی تھی یہ بزرگ محمد بن عبداللہ بن تومرت تھے۔ اگر پولٹیکل حیثیت سے دیکھا جائے تو محمد بن تومرت عجیب وغریب قوت و حسن تدبیر کا شخص تھا ہم اس شخص کے حالات ذرا تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ چالاکیاں زہد و اتقا کے دامن میں چھپ کے کسقدر سرسبز ہوتی ہیں۔ محمد بن تومرت اگرچہ مسلمانوں میں بہ حیثیت دین وقعت کی نظر سے نہ دیکھا جائیگا مگر اُسکی سوانحعمری سے اکثر تجربات حاصل ہونگے جن کی اہل اسلام کو ہمیشہ ضرورت ہونا چاہیئے اور خاصتہً آجکل ہی۔

اکثر مورخین مغرب کا بیان ہے کہ جن دنوں امام غزالی نظامیہ بغداد میں درس دیتے تھے اور اُنکے حلقہ درس میں اطراف عالم کا ایک عجیب مجموعہ مرتب رہتا تھا۔ اتفاقاً ایک روز وہ بیٹھے درس دے رہے تھے کہ ایک نوعمر بے ریش دبروت طالب علم بغداد کی معمولی وضع کے خلاف ایک سوتی ٹوپی پہنے ہوئے مدرسہ میں آیا۔ امام غزالی نے غور سے اُسکی صورت دیکھی اور متحیر ہو کے پوچھا "تم کس مُلک کے رہنے والے ہو؟" نوجوان نے کہا "میں ارض مغرب کے شہر سوس اقصے کا رہنے والا ہوں" امام غزالی نے حیرت سے کہا "اُفوہ! تو غالباً تم قرطبہ کے مدرسہ میں بھی رہے ہو گے جو دُنیا کے تمام مدارس سے عمدہ خیال کیا جاتا ہے؟" طالبعلم نے عرض کیا "جی ہاں" اسکے بعد امام غزالی قرطبہ کے مشہور علما کے حالات

دریافت کرتے گئے اور وہ نوجوان بتاتا گیا۔ اُسکے جوابات سے امام نے اندازہ کرلیا
کہ بیشک اپنے بیانات میں یہ شخص سچا ہے۔ اور جس سنجیدگی سے اُس نے ہر خیال
کو ظاہر کیا اُس سے اُنھوں نے جانا کہ طالب علم ذہین و دانا بھی ہے، دریافت کیا۔
"تم نے میری کتاب احیاء العلوم بھی دیکھی ہی؟" نوجوان نے کہا "جی ہاں میں
اُسکی زیارت کرچکا ہوں" امام نے پوچھا "اچھا بتاؤ اُسکی نسبت علمائے قرطبہ
کے کیا خیالات ہیں؟" طالب علم نے اس سوال پر سر جُھکا لیا اور کچھ جواب نہیں دیا۔
امام نے اُسکے سکوت کو نہایت حیرت سے دیکھا اور کہا "جو بات ہو تم بے خوف
آزادی سے بیان کرو" امام کے مضطربانہ اصرار پر اُس نوجوان طالبعلم نے کہا "اگرچہ
اس امر کا عرض کرنا گستاخی ہے مگر اب آپ اصرار فرماتے ہیں تو بحکم الامر فوق الادب
عرض کرتا ہوں۔ آپ کی کتاب پر وہاں کفر و الحاد کا الزام لگایا گیا۔ علمائے قرطبہ
نے اسپر خوب غور کرنے کے بعد باہم مشورہ کرکے حکم دیا کہ احیاء العلوم علانیہ
جلادی جائے۔ اس کارروائی کے بعد انہوں نے بادشاہ علی بن یوسف کو اطلاع
دی کہ احیاء العلوم یہاں کثرت سے پھیلتی جاتی ہے اور اُس سے مسلمانوں کے
عقائد بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ جسکا یہ نتیجہ ہوا کہ بادشاہ کے حکم سے قرطبہ کے
علاوہ مراکش۔ مدینہ فاس۔ قیروان اور مغرب کے اُن تمام شہروں میں جن میں
علم ہے احیاء العلوم علانیہ جلادی گئی" نوجوان کا یہ بیان سنتے ہی امام غزالی
کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ فوراً اُنہوں نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور
کانپتے ہوئے ہونٹھوں سے خدا کی درگاہ میں اس توہین کی صلاح دینے والے
علما اور نیز اُس بادشاہ کے حق میں جسکے حکم سے اُنکی کتاب کی ایسی توہین ہوئی
تھی بددعا کی۔ جو لوگ اس موقع پر موجود تھے ان کا بیان ہی کہ بادشاہ علی بن یوسف
کے حق میں امام کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے "بارالہا! جس طرح اُس نے

میری کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے برباد کیا ہے اُسی طرح اُسکی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے تباہ کر۔ اُسکی تمام حکومت اور جو کچھ اُسے ورثہ میں ملا ہی سب اُسکے ہاتھ سے چھین لے" امام کی اُس دعا پر طلبہ کے حلقہ سے "آمین" کی آواز بلند ہوئی امام غزالی نے ہنوز ہاتھ نیچے نہیں کئے تھے کہ یہ مغربی نوعمر طالبعلم آگے بڑھا اور کہا "یا امام اپنی دُعا میں اتنا اور اضافہ فرما دیجئے کہ ان باتوں کی تعمیل خاص میرے ہاتھ سے ہو" امام نے اپنے ہاتھ دعا میں روک کے کہا "اور خداوندا! اس دُعا کی تکمیل خاص اسی شخص کے ہاتھوں سے ہو" اور طلبہ نے پھر آمین کہی۔ یہ طالبعلم محمد بن تومرت تھا جس نے یہاں سے مغرب میں واپس جاکے دعویٰ مہدویت کیا۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ محمدؐ بن تومرت کے جی میں دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی حکومت حاصل کرنے کا ایک مضطربانہ شوق تھا۔ وہ اپنے عنفوان شباب ہی سے اسی اُدھیڑبن میں رہا کرتا تھا۔ جس طرح امام غزالی کا یہ واقعہ اس کے اس شوق کی خبر دیتا ہے اُسی طرح ایک اور واقعہ ہے جس نے اُسکے ارادوں میں بہت زیادہ قوت دیدی تھی۔ علامۂ ابن خلکان اُسکے حالات میں لکھتے ہیں کہ ایام طالب علمی میں اُسے علم جفر کی ایک کتاب مل گئی۔ اس کتاب کا اُس نے خوب غور سے مطالعہ کیا اور اُسکے احکام سے اُسے معلوم ہوا کہ سوس میں نسل بنی فاطمہ سے ایک شخص پیدا ہوگا جو لوگوں کو خدا کی طرف بلائے گا۔ اور اسکا مستقر ایک مقام قرار پائے گا جسکے نام میں حروف ت ی ن م ل ہونگے۔ اُسے ایک اور شخص ملے گا جسکی مدد سے وہ اپنے اغراض میں کامیابی حاصل کریگا اُس شخص کے نام میں حروف ع ب دم وم ن ہونگے۔ طالبعلمی کے بعد اپنی زندگی اُس نے اس شہر اور اس نام کے شخص کے ڈھونڈھنے میں صرف کرنا شروع کی تاکہ خود اپنے آپ کو وہ شخص ثابت کرے جو سوس میں پیدا ہونے والا ہے۔ اسلئے کہ

اطراف سوس میں پیدا بھی ہوا تھا اور نسل بنی فاطمہ سے بھی تھا۔

محمد بن تومرت نسبًا امام حسن علیہ السلام کی نسل سے تھا۔ اور کوہستان سوس بن عشرہ کے دن ۴۸۵ھ میں پیدا ہوا تھا۔ پہاڑوں میں نشو و نما پاکے کم عمری ہی میں بغرض طالب علمی وطن سے نکلا۔ پھرتے پھراتے اسپین و مصر ہوتا ہوا بغداد پہنچا۔ تین برس امام غزالی کی صحبت میں رہا۔ اسی زمانہ میں امام ممدوح کے علاوہ کیا ہراشی اور طرطوشی وغیرہ دیگر اساتذہ بغداد کے فیض درس سے بھی فیضیاب ہوا۔ تحصیل علم سے فارغ ہوکے بغرض حج مکہ معظمہ گیا۔ مدت تک وہاں مقیم رہا۔ اور علوم دینی میں علمائے حرمین سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔

ابن تومرت نہایت ہی متقی و پرہیزگار شخص تھا اسکی دینداری اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ خود مخالف شرع نہ ہونا درکنار کسی اور کو بھی کوئی خلاف شرع بات کرتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ اپنے ان جذبات کے ظاہر کرنے میں اسقدر جری اور آزاد تھا کہ نہ کسی بادشاہ کا خوف اُسکے دل پر بیٹھتا تھا۔ نہ عوام کی برہمی سے ڈرتا تھا۔ نہ ایسے موقعوں پر علما و فضلا کا کچھ پاس و لحاظ کرتا تھا۔ یہ آزادی ابتدا ہی فطرتی طور پر اُسکے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اب علم و فضل نے اس میں اور زیادہ جرأت اور ضد پیدا کر دی۔ ذرا سی بات پر بلا تامل علما سے لڑ بیٹھتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اکثر شہروں میں اُسے سخت ذلتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر اُس نے کبھی اس امر کی پروا نہ کی۔ مکہ معظمہ سے آخر اسی قسم کی آزادانہ خودسریوں کی بدولت اُسے نکلنا پڑا۔ مکہ سے نکل کے مصر میں پہنچا، وہاں بھی اسی قسم کی صورتیں پیش آئیں اور وہاں سے بھی نکالا گیا۔ سلطنت نے جبرًا و قہرًا اُسے شہر بدر کیا۔

یہ آزادیاں اُس سے نبھ بھی خوب جاتی تھیں۔ اس لئے کہ زبان اتنی

شیریں پائی تھی اور عربی میں ایسی فصیح و بلیغ بلکہ سحر نما تقریر کرتا تھا کہ جہاں اسکی مخالفت کا شور ہوتا تھا وہاں بہت سے اُسکے طرفدار بھی ہو جاتے تھے۔ دولت دُنیاوی کی اُسے کچھ پروا نہ تھی۔ اور اِس سادگی سے سفر کرتا تھا کہ سوا ایک چھڑی اور چھوٹے مشکیزے کے کبھی کوئی چیز اپنے ہمراہی نہ رکھی۔ مخالفت کے طوفان میں پڑکے اُس نے نجات کی یہ آخری تدبیر نکالی تھی کہ سڑی سودائی بنجاتا۔ اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا۔ قاہرہ سے جب نکلوایا گیا تو اسکندریہ میں جا کے جہاز پر سوار ہوا اور مغرب کے رُخ چلا۔

جہاز والوں میں کم ایسے تھے جو پابند شرع ہوں۔ محمد بن تومرت نے اِس بات پر اُن سے لڑنا شروع کیا۔ مگر یہاں اُسکا رعب ایسا بیٹھ گیا کہ کسی کو علانیہ مخالفت کی جُرأت نہ ہوئی۔ خفیف ناراضیاں دل ہی دل میں دب گئیں اور جب مہدیہ کے ساحل پر اترا ہے جہاز میں کوئی نہ تھا جو پابند صلوٰۃ نہ ہو یا کسی دن تلاوت قرآن میں ناغہ کرتا ہو۔ محمد بن تومرت ۵۰۵ھ میں داخل مہدیہ ہوا۔

مہدیہ میں اِن دنوں امیر یحییٰ بن تمیم بن معز کی حکومت تھی۔ یہ جاکے ایک مسجد میں اُترا جو شہر کی ایک سڑک کے کنارے پر واقع تھی۔ مسجد کے اس حجرے میں جو سڑک کی طرف تھا بیٹھا۔ گذرنے والوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اور جہاں کسی کو کسی خلاف شرع کی حالت میں دیکھتا فوراً اتر کے دست گریباں ہو جاتا۔ دو ہی تین دن میں بہتوں کی ڈھولکیں پھاڑ ڈالیں۔ بہتوں کے طبل پاش پاش کئے۔ بہتوں کی بوق و قرنا توڑے۔ بہتوں کے تنبورے چھین کے زمین پر دے مارے۔ سیکڑوں شراب کے خم اور دیگر ظروف شراب چکنا چور کئے۔ غرض سارے شہر میں ایک آفت مچادی ان کارروائیوں سے اسکی شہرت ہوگئی۔ عام لوگ معتقد ہونے لگے۔ اور دھوم

ہوگئی کہ ایک بڑے متبحر عالم وارد مہدیہ ہوئے ہیں۔ طلبہ نے آکے گھیرا اور سلسلہ درس شروع ہوا ہوتے ہوتے اسکی شہرت امیر کے کان تک پہنچی اُس نے دربار میں بلوایا۔ بڑی قدر و منزلت کی۔ اور بہت کچھ حسن عقیدت ظاہر کرکے رخصت کیا۔

ابن تومرت کو ایک جگہ قرار کیونکر آسکتا تھا اس لئے کہ وہ اپنے دل میں ایک خاص مشن کے اغراض پورے کرنا چاہتا تھا۔ وہ علم رمل کے بتائے ہوئے رفیق اور شہر کو ڈھونڈہتا پھرتا تھا۔ غرض چند روز کے بعد مہدیہ چھوڑکے بجایہ میں پہنچا۔ وہاں بھی حسب معمول اپنی آزادانہ خودسریوں کی مشق کرتا رہا۔ اتفاقاً اپنے قیام بجایہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ ایک گاؤں میں گیا جسکا نام ملالہ تھا اس گاؤں میں راہ چلتے چلتے اس نے ایک نوعمر اور خوبرو لڑکے کو دیکھا جس کے چہرے پر اسے ذہانت و ذکاوت کے علاوہ دولت و اقبال کے ستارے بھی چمکتے نظر آئے۔ اس لڑکے کی صورت میں کچھ ایسی دلفریبی تھی کہ محمد بن تومرت اپنے جذبات کو بالکل چھپا نہ سکا۔ بے اختیار اُسکے قریب گیا اور کہا "میاں صاحبزادے تمہارا نام کیا ہے؟" لڑکے نے اپنی فتنہ انگیز آنکھیں اُسکی طرف اُٹھائیں اور کہا "عبدالمومن" اس نام کے سنتے ہی وہ بے اختیار چونک پڑا اور دل میں کہہ اٹھا "میں تمہاری ہی تلاش میں تو مدتوں سے سرگرداں ہوں!" عبدالمومن کا نام سُنتے ہی محمد بن تومرت کی وہ کیفیت ہوئی جو افریقہ کے جادوگر کی چین میں علاءالدین کی صورت دیکھکے ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اُسے ازغیبی دولت و سلطنت کے ملنے کا یقین ہوگیا۔ پھر محمد بن تومرت نے عبدالمومن سے پوچھا "اور تمھارا مکان کہاں ہے؟" جواب ملا "کومیہ میں" دریافت کیا "ارادہ کیا ہے؟" کہا "ارض مشرق میں جاتا ہوں" پوچھا "کیوں؟" بتایا "علم کے شوق میں" ابن تومرت نے کہا "علم و فضل دولت و ثروت سب چیزیں تم کو خدا نے دیں

آؤ میرے ساتھ آؤ۔ میں وہ باطنی رموز تم پر ظاہر کرونگا کہ تم کو میرے کہنے کا یقین آجائے گا" اسکے بعد ابن تومرت نے سارے راز اُس پر ظاہر کر دیئے۔ اور یقین دلایا کہ وہ ایک بہت بڑا شاہنشاہ ہونے والا ہے۔ الغرض اسوقت سے عبدالمومن اُس کے ہمراہ ہوا۔

جب یہ دونوں شخص ایک دوسرے کے رموز سے واقف ہوئے تو ایک تیسرا شخص ہمراہ ہوا اور ایک مضبوط اتحاد ثلاثہ قائم ہو گیا۔ یہ تیسرا شخص جسکا نام عبداللہ شرابشی تھا بڑا زبردست فقیہ اور متبحر عالم تھا۔ قرآن مجید اور موطائے امام مالک کا حافظ تھا۔ اور فصاحت و بلاغت میں ابن تومرت کا ہم پلہ تھا۔ اب ثلاثہ ہی میں تینوں نے مل کے اپنی کارروائی شروع کرنے کی تجویز کی۔ اور پہلی حکمت عملی یہ قرار پائی کہ شرابشی بالکل گونگا بنجائے۔ اور اپنے تمام علم و فضل اور فصاحت و بلاغت کو اُس موقع پر یکایک ایک معجزے کی طرح ظاہر کرے جب اُسکی ضرورت پیش آئے گی۔ یہ تجویز بہت مناسب خیال کی گئی اور شرابشی ایک گونگے مُرید کی طرح ابن تومرت کے ساتھ ہو لیا۔ اب اس بات کی کوشش کی گئی کہ مُریدوں کی ایک چھوٹی اور مضبوط جماعت اپنے ساتھ لے۔ ابن تومرت کی ایک حکمت عملی یہ بھی تھی کہ ایسے لوگوں کو مرید بنا کے اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتا تھا جو علم کے اعتبار سے تو معمولی لیاقت کے لوگ ہوں مگر خوبصورت ہوں اور ہاتھ پاؤں کے بہت اچھے ہوں۔ اس لئے کہ ایسے لوگ پورے ارادت کیش بھی ہو سکتے تھے۔ اور لوگوں پر اُن کا اثر بھی بخوبی پڑ سکتا تھا۔ الغرض اسی قسم کے چھ سات آدمی اس نے چُن چُن کے فراہم کئے جو ہمیشہ اُسکے بارونق جلوس کا کام دے سکتے تھے۔

اِس مختصر دلفریب اور رعبدار جماعت کے ساتھ بجایہ سے نکل کے وہ

شہر مراکش میں پہنچا۔ اور یہی سلطنت تھی جسکو اُس نے اپنا شکار بنانے کی کوشش کی۔ کیونکہ سارے ارض مغرب میں ان دنوں اس سے بڑھکر کوئی باہیبت قوت نہ تھی۔ حتے کہ اس عہد کے فرماں روایان اسپین بھی اس سلطنت کے آگے سر جھکائے ہوئے تھے۔ محمد بن تومرت مع اپنے رفقا کے شہر کے باہر ایک ویران مسجد میں اُترا۔ اپنی عادت کے موافق عوام شہر، عہدہ داروں۔ علماء و فضلا۔ حتے کہ خود سلطنت پر شرعی نکتہ چینیاں شروع کر دیں۔ اور اسکے ساتھ ہی وعظ میں بادشاہ پر جو در اصل نہایت ہی نیک دل تاجدار تھا سختی سے لعن وطعن کا دروازہ کھولا۔ یہ خبر ہنوز شہرت کے انتہائی درجہ تک نہ پہنچی تھی کہ ایک دن محمد بن تومرت نے ایسی جرأت کر دی کہ سارے شہر میں ہلڑ ہو گیا۔

وہاں رسم تھی کہ شاہزادیاں بہت کم پردے کی پابندی کرتی تھیں۔ غالباً نصارائے اسپین کے اختلاط سے وہاں پردہ چنداں ضروری نہ خیال کیا جاتا ہو۔ اسی رسم کے مطابق ایک روز بادشاہ وقت ابوالحسن علی بن تاشقین کی بہن اپنی لونڈیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار بے نقاب شہر کی سڑکوں پر سے گذری۔ محمد بن تومرت کی بے روک طبیعت بھلا اس بات کو کیونکر گوارا کر سکتی تھی۔ اپنے آٹھ نو مریدوں کے گروہ سے عورتوں کے غول پر بے تکلف جھپٹ پڑا۔ اور اکثر لونڈیوں کو مار پیٹ کر زخمی کر دیا۔ مارتا جاتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ مسلمان عورتیں اور یوں بے پردہ سیر کرتی پھریں۔ خود شاہزادی کے گھوڑے پر اتنے ڈنڈے مارے کہ وہ انتہا سے زیادہ بھڑکا اور شاہزادی اُسکی پیٹھ پر سے گر کے زخمی ہو گئی۔ عبداللہ بن تومرت تو مار پیٹ کے چلدیا۔ اور لوگ شاہزادی کو اٹھا کے محل سرائے شاہی میں لے گئے۔ یہ خبر سارے شہر میں پھیلی اور لوگ ان لوگوں کی اتنی بڑی جرأت و دلیری پر تعجب کرنے لگے۔

اِس واقعہ کے بعد جمعہ کا دن آیا اور محمد بن تومرت مع اپنے مریدوں کے مسجد جامع میں پہونچا۔ اور سب ہمراہی تو اِدہر اودہر بیٹھ گئے مگر خود خاص اُس جگہ پر جا کے کہڑا ہوا جہاں بادشاہ نماز پڑہا کرتا تھا وہ عہدہ دار جسکے ہاتھ میں مسجد کا انتظام تھا اُس کے قریب آ کے کہا دو کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ یہ جگہ صرف بادشاہ اسلام کے لئے مخصوص ہے؟ اور اُسکے سوا یہاں اور کوئی نہیں کہڑا ہو سکتا؟" اس پر محمد بن تومرت نے نہایت ہی برہمی کے ساتھ اُسکی طرف گھور کے دیکھا اور سنجیدگی کے لہجہ میں کہا" ان المساجد للہ (مسجدیں صرف اللہ کی ہیں) لوگ اس دلیری پر حیرت کرنے لگے اور اُس نے اُنکی طرف متوجہ ہو کے خلاف شرع امور کی تردید میں ایک پرجوش تقریر شروع کر دی یہ تقریر ہو ہی رہی تھی کہ بادشاہ آ گیا اور لوگ حسب عادت چاروں طرف سے آداب شاہی بجا لانے لگے۔ محمد بن تومرت بادشاہ کی جگہ پر جہاں کہڑا تھا بیٹھ گیا۔ اور سلام کرنا کیسا اُلٹے بادشاہ کیطرف سے منہ پھیر لیا۔ بادشاہ ابو الحسن واقعی نہایت ہی نیک نفس شخص تھا اوس نے اس بات کی پروا ہی نہ کی اور دوسری جگہ کہڑے ہو کے نماز پڑھ لی۔ بعد نماز جیسے ہی امام نے سلام پھیرا محمد بن تومرت کہڑا ہو گیا۔ اور بادشاہ کیطرف متوجہ ہو کے پہلے تو "سلام علیک" کہا اور پھر کہنے لگا اے بادشاہ رعایا پر جو مظالم ہو رہے ہیں اُنکی خبرے مانا کہ اُنکی آواز تیرے کان تک نہیں پہونچی۔ مگر خدا کے ہاں سب جواب دہی کرنا ہو گی تب تو یہ کہہ کے نہ چھوٹ سکے گا کہ مجھے خبر نہ تھی۔ غریبوں کی جان و مال کی حفاظت کا تو ذمہ وار ہے" بادشاہ نے اسکا کچھ جواب نہ دیا اسلئے کہ اُس نے محمد بن تومرت کا کچھ حال ابھی تک نہ سُنا تھا۔ اسکی اسوقت کی تقریر سے اُس نے خیال کیا کہ شاید یہ کوئی عالم ہے اور کچھ غرض رکھتا ہے۔ اسی خیال سے جاتے وقت بعض لوگوں سے کہتا گیا کہ اس شخص سے دریافت کرو اگر اسکی کوئی غرض ہو تو پوری کر دیجائے محمد بن تومرت کو جب بادشاہ کا یہ پیام پہونچا یا گیا تو بولا "اس سے کہدو میری غرض دنیا

نہیں ہے۔ میں صرف مسلمانوں کی بھلائی چاہتا ہوں "

اب اس واقعہ کے بعد بادشاہ کو محمد بن تومرت کے تمام حالات معلوم ہوئے کہ سلطنت کی مخالفت کرتا ہے۔ اور شاہزادی کو بھی اسی نے زخمی کیا۔ تو اُس نے تمام علمائے دربار سے کہا اس سے میرے سامنے بلا کے مناظرہ کرو۔ آخر معلوم تو ہو کہ اسکی غرض کیا ہی۔ اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور محمد بن تومرت دربار شاہی میں حاضر ہوا بادشاہ کیطرف سے مریہ کے قاضی محمد بن اسود نے تقریر کی اور کہا کیا دیہ صحیح ہی جو مشہور ہو رہا ہی کہ تم بادشاہ کو برا بھلا کہتے پھرتے ہو؟ اور بادشاہ بھی کون جیسا نیک نفس پرہیز گار۔ خواہشات نفسانی کا دشمن اور احکام ربانی کا پابند ہی؟" اسکے جواب میں محمد بن تومرت نے بادشاہ کے سامنے جرأت اور فصاحت کیسا تھ کہا "یہ جو آپ پوچھتے ہیں کہ بادشاہ کے خلاف کلمات میں نے کہے یا نہیں اسکا جواب یہ ہے کہ ہاں میں نے کہے اور بیشک کہے باقی رہا یہ کہ بادشاہ متقی پرہیز گار اور خدا ترس ہے اسکی نفی میں بس اسیقدر کافی ہے کہ اُس نے تمہاری باتوں پر اعتبار کر لیا۔ اور جو تم سب کہدیتے ہو اسی کو سچ جانتا ہی۔ حالانکہ وہ خوب جانتا ہی کہ وہ سلطنت کی تمام خرابیوں کا جوابدہ ہی۔ خدا کے سامنے یہ کہکے نہ چھوٹ جائیگا کہ مجھے اسکی اطلاع نہیں ہوئی۔ قاضی صاحب۔ کیا آپ نے نہیں سُنا۔ کہ مسلمانونکی آبادی میں سور مارے مارے پھرتے ہیں؟ شراب علانیہ بک رہی ہی؟ اور یتیموںکے مال پر دست ستم دراز ہے؟" یہ تقریر اسقدر مؤثر اور دل میں چبھتی ہوئی تھی کہ بادشاہ نے آبدیدہ ہوکے نہایت ندامت سے سر جھکا لیا۔ اور دل میں کہا بیشک یہ سچ کہتا ہی۔ تمام فقہا نے عرض کیا "حضور اس شخص کی باتوں سے بوئے بغاوت آتی ہی۔ اس سے مطمئن نہ ہونا چاہیئے" اور سب سے زیادہ اس بات پر علامہ مالک بن وہیب نے زور دیا جو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل رکھتے تھے اور کہا "اگر اسکا قتل خلاف

مصلحت ہے تو کم سے کم یہ ہونا چاہیئے کہ یہ حراست میں رکھا جائے اور اسکے مصارف کیلئے روزانہ ایک دینار مقرر کردیا جائے۔ مجھے ڈر ہی کہ اس ایک دینار کے عوض میں اسکا ہاتھ سارے شاہی خزانہ تک نہ پہونچ جائے" مگر بادشاہ کے ایک وزیر نے کہا، "یہ لوگ روٹیوں کو تو محتاج ہو رہے ہیں سلطنت کو کیا ضرر پہنچا سکیں گے بس انکی سزا کے لئے یہ کافی ہی کہ خارج البلد کردیئے جائیں" بادشاہ آخری رائے سے اتفاق کیا۔ اور جوش رحم سے کہا "دین تو ایسے صاحب علم ناصحوں پر ایسا ظلم نہیں گوارا کرسکتا" غرض شاہی حکم کے مطابق محمد بن تومرت مع اپنے ہمراہیوں کے شہر مراکش سے نکال دیا گیا۔

یہاں سے نکل کے یہ لوگ مراکو کے ایک چھوٹے شہر اغمات میں پہونچے۔ وہاں عبدالحق بن ابراہیم جو اس شہر کا ایک با اثر عالم تھا انکے حق میں بہت ہی بکار آمد مشیر اور دوست ثابت ہوا اُس نے محمد بن تومرت سے کہا "اگر بادشاہ کی ملک میں رہ کے تم آزادی سے اسکی مخالفت کرنا چاہو تو تم کو شہر اغمات میں رہنا چاہیئے اسلئے کہ یہ شہر تمہاری حفاظت نہ کرسکیگا۔ ایسی کارروائیوں کے لئے سب سے زیادہ مناسب اور موزوں مقام ایک کوہستانی قصبہ ہی جو پہاڑوں کے دشوار گذار دروں میں واقع ہی۔ اور یہاں سے ایک دن کی راہ ہی۔ اُس گاؤں کا نام تینمل ہے تینمل کا نام سنتے ہی محمد بن تومرت مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ اس لئے کہ یہی وہ نام تھا جو اُسکے جفر کے فرشتہ نے بتایا تھا۔ اب اُسے اپنی کامیابیوں کا بالکل یقین ہوگیا۔ فوراً عبدالحق سے رخصت ہوا اور تینمل کی راہ لی۔

اہل تینمل نے انھیں علما اور طلبہ کے لباس میں دیکھکے بڑی تعظیم وتکریم کی بڑی عزت سے اوتارا۔ اور انکے رہنے کو اپنے اچھے اچھے مکان خالی کردیئے۔ ابن تومرت نے یہاں چند ہی روز کے بعد سے بادشاہ کی خلاف وعظ کا سلسلہ شروع کردیا تو ہستان

کے تمام لوگ جوق کے جوق آتے اور اسکی زیارت کو موجب برکت خیال کرتے ہر آنے والے سے یہ بادشاہ کی مخالفت کا کلمہ پڑھواتا اور جو لوگ اُسکی رائے سے اتفاق کر دیتے اُنکو اپنے مخصوصین میں شامل کرتا۔ ایک یہ بھی اُصول تھا کہ توانا و تندرست نوعمروں اور مالداروں کو زیادہ عزیز رکھتا۔ کوہستان کے ذی عقل و صاحب اثر لوگ اگرچہ اُسکے بالکل مخالف تھے۔ مگر عوام میں سے اکثر کو اُس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے موافق کر لیا۔

اسی اثنا میں محمد بن تومرت کو اپنے اغراض پورے کرنیکا ایک نہایت عمدہ موقع ملگیا وہ یہ کہ اہل کوہ کو اکثر دیکھتا تھا کہ وہ تو سانولے تھے مگر اکثر لڑکے زرد اور بھورے رنگ کے تھے۔ ایک دن اُس نے لوگوں سے اسکا سبب پوچھا جسکے جواب میں انھوں نے سکوت کیا اور ندامت سے سر جھکا لئے۔ ابن تومرت کے زیادہ اصرار پر انھوں نے بیان کیا "ہم لوگوں سے خراج سلطنت وصول کرنیکے لئے ہر سال شاہی غلام آیا کرتے ہیں جو عموماً رومی یونانی اور افرنجی ہیں۔ اگرچہ بادشاہ کو اسکی خبر غالباً نہ ہوگی مگر وہ لوگ ہماری بڑی رسوائی کرتے ہیں۔ آتے ہی ہمیں ہمارے گھروں سے نکال دیتے ہیں اور ہماری عورتوں کو بے عزت کر ڈالتے ہیں۔ جبتک وہ لوگ یہاں رہتے ہیں ہم پر یہی ظلم رہتا ہے۔ اور اسیوجہ سے ہماری عورتوں کی اکثر اولادیں انکے رنگ پر ہوتی ہیں" محمد بن تومرت نے نہایت طیش دلانے والے لہجہ میں کہا "خدا کی قسم اس زندگی سے موت اچھی ہے!" سبھوں نے کہا "بیشک"۔ پوچھا "بھلا اگر کوئی اس بارے میں تمہاری دادرسی کرنا چاہے تو اُسکا ساتھ دوگے؟" سب نے بالاتفاق کہا "ساتھ دینا کیسا ہم اُسکے حکم پر اپنی جانیں نثار کرنیکو موجود ہو جائیں گے" یہ وعدے کے ابن تومرت نے کہا "تو اچھا۔ اب کی مرتبہ جب وہ غلام آئیں تو حسب معمول انکو اپنی بی بیوں سے ملانا اور انکو خوب شراب پلانا" اہل تینل نے کہا "بہتر" چند روز

کے بعد وہ زمانہ آگیا۔ شاہی غلام آئے اور ابتدا ئر بڑی خاطر داری کے ساتھ گھروں میں اوتارے گئے اور شرابیں پلا پلا کے بدمست کرد یے گئے۔ یہ کام پورا کرکے لوگوں نے ابن تومرت کو خبر کی۔ اوس نے فوراً قتل عام کا حکم دیدیا اور سب غلام مارڈالے گئے۔ صرف ایک غلام جو اتفاقاً کسی کام کیلئے اپنی فرودگاہ سے باہر گیا ہوا تھا باہر ہی خبردار ہو گیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ دوسرے دن گھاٹیوں سے نکل کے بادشاہ کے دربار میں پہونچا۔ اور غلاموں کے قتل ہونیکا حال بیان کیا۔ اوس نے یہ بھی کہدیا کہ وہاں محمد بن تومرت سب کا سردار بنا ہوا ہے۔ اور اُسی کے حکم سے یہ کارروائی ہوئی۔

بادشاہ کو یہ سُن کے بڑی فکر پیدا ہوئی۔ اور پچھتانے لگا کہ ابن تومرت کے بارے میں بیشک مالک بن وُہیب ہی کی رائے ٹھیک تھی۔ اس خونریزی کے انتقام کے لئے دس ہزار سوار روانہ کئے گئے۔ جو فوراً مراکش سے چل کے تینمل کی گھاٹیوں میں گھُسے۔ محمد بن تومرت اس نتیجہ کو پہلے ہی سے سمجھ چکا تھا۔ اور جانتا تھا کہ بادشاہ کی فوج ضرور آئیگی۔ اوس نے تمام پہاڑ والونکو درّوں میں دونوں طرف پہاڑوں پر بٹھادیا تھا۔ اور حکم دیدیا تھا کہ جیسے ہی بادشاہ کی فوج آئے تم اوپر سے پتھر لڑھکانا اور مارنا شروع کردو۔ یہ حکمت نہایت بکارآمد ثابت ہوئی۔ دس ہزار سواروں ہر کی کوہستانی منزل میں پتھروں کے نیچے کچل کچل کر اور چوٹ کھا کھا کے تباہ ہو گئے اسی حالت میں رات ہو گئی۔ جسکے اندھیرے میں باقیماندہ سوار بالکل درہم و برہم ہو کے بھاگے جب یہ آفت رسیدہ لشکر مراکش میں پہنچا اور بادشاہ کو اسکی اطلاع ہوئی تو بہت پریشان ہوا اور مجبوراً فیصلہ کرلیا کہ تینمل والوں سے اب کوئی مزاحمت نہ کیجائے۔ آخر کب تک بغاوت کرتے رہینگے

اب محمد بن تومرت کو اس بات کی ضرورت معلوم ہوئی کہ اپنی جماعت کو زیادہ قوی کرے کیونکہ اپنی حفاظت تو وہ بہت اچھی طرح کامیابی کیساتھ کرچکا اور اب وقت آگیا کہ پہاڑوں

سے نکل کے بادشاہ کے شہروں پر حملہ آور رہوا۔ یہ ضرورت یوں پوری ہوئی کہ ایک روز صبح کو نماز کیوقت ونشریشی نے کہا "میں کچھ کہنا چاہتا ہوں" ابن تومرت پہاڑ والوں کے سامنے چونک پڑا۔ اور کہنے لگا کہ ایک گونگے شخص کا بات کرنا بالکل عجیب بات ہی فوراً اُس نے تمام لوگونکو بلوابھیجا۔ جب سب آگئے تو ابن تومرت کی اجازت سے عبداللہ ونشریشی ممبر پر جاکے کھڑا ہوا اور سب کیطرف خطاب کرکے کہنے لگا "یا معاشر المسلمین آجتک میں گونگا تھا لیکن الحمدللہ کہ آج خدا نے مجھے تمام جسمانی وروحانی نقصانات سے پاک کردیا۔ رات کو ایک فرشتہ آسمان سے اوترکے میرے پاس آیا اوس نے میرا سینہ شق کرکے ساری برائیاں اور سارے نقصانات نکال ڈالے اور مجھے بالکل فرشتوں کیطرح معصوم بناکے میرے دل میں ایمان و علم بھر دیا۔ یہی سبب ہے کہ میں جو کل ایک جاہل اور گونگا تھا آج ایک زبردست عالم حافظ قرآن و موطائے مبارک ہوں اور اس فصاحت سے تقریر کر رہا ہوں"۔ اس معجزے نے سب کے دلمیں بڑا جوش پیدا کردیا۔ اور ہر شخص صدق دل سے اوسپر ایمان لایا۔ محمد بن تومرت نے اُٹھ کے کہا "الحمدللہ کہ خدا نے آپکو ہمارے لئے ایک معیار بنا دیا۔ اور آپ کے ذریعہ سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہی کہ ہم میں کون کیسا ہی۔ فرمایئے ہم لوگونکی نسبت آپکی کیا رائے ہی؟" ونشریشی نے کہا "تم مہدی قائم بامراللہ ہو۔ جو کوئی تمہاری پیروی کرے وہ ناجی ہی اور جو مخالفت کرے وہ ناری ہی"۔ ونشریشی کے اس جملہ سے یہ فائدہ اٹھایا گیا کہ پہاڑ پر جتنے لوگونکی نسبت مخالفت کا گمان تھا عام اس سے کہ وہ عالم وفاضل ہی کیوں نہ ہوں سب قتل کر ڈالے گئے۔ اور تنمیل مخالفوں سے بالکل خالی ہوگیا۔

اسی وقت سے ابن تومرت نے لڑائی شروع کردی اور دس ہزار کوہستانیوں کی ایک فوج عبدالمومن اور ونشریشی کے ہمراہ کرکے مراکش روانہ کی اس لڑائی

کا نتیجہ ایسا الٹا ہوا کہ یقیناً سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا ہوتا مگر مہدی کی ہوشیاری اپنا پورا کام کر گئی۔ لڑائی میں فوج کو بڑی فاش شکست ہوئی۔ ونشریشی مراکش کی دیوار کے نیچے مارا گیا۔ اور عبدالمومن چند رفقا کے ساتھ ناکام و شکستہ دل واپس آیا۔ عبدالمومن تینمل تک پہونچا بھی نہ تھا کہ قضا نے ابن تومرت کا کام تمام کر دیا۔ ابن تومرت کو مرتے وقت اس شکست کی خبر معلوم ہو گئی تھی اُس نے تمام موجودہ لوگوں کو بلا کے کہا "میں تو تم سے رخصت ہوتا ہوں مگر میرا یہ پیام عبدالمومن کو پہنچا دینا میرے بعد دین کی تقویت کیلئے خدا نے اُسیکو میرا جانشین بنایا ہے۔ میری طرح اب اُس کی اطاعت سب پر فرض ہے۔ لڑائی میں شکست ہوئی تو کوئی مضائقہ نہیں معرکہ ہائے جنگ میں ہمیشہ یہی رہا ہے کہ آج ہم غالب ہیں اور کل کوئی اور۔ مگر ہاں انجام میں عبدالمومن ہی کو کامیابی ہوگی۔ اس لئے کہ خدا کی مرضی یہی ہے۔ جو کام شروع ہوا ہے عبدالمومن سے تاکید کر دینا کہ اُسکے لئے برابر پاکبازی سے کوشش کرتا رہے" یہ کہہ کے اُس نے دُنیا سے مفارقت کی۔ اگرچہ عبدالمومن نے ابن تومرت کے مرنے کی خبر سُن کے بڑا صدمہ اٹھایا مگر اس کی وصیت پوری کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ چند ہی روز بعد عبدالمومن سے بڑا کوئی بادشاہ سرزمین مغرب میں نہ تھا۔ اگر انصاف سے پوچھیے تو عبدالمومن کیلئے وہ سب سامان تیار کر گیا تھا۔ لیکن یہ حسرت دل میں لے گیا کہ جس سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی اس سے خود بالکل نفع نہ اُٹھا سکا۔ ابن تومرت ۵۲۴ھ میں مرا۔

والبی

جس وقت دحیہ کلبی حضرت سرورِ کائنات کا نامہ تبلیغ لیکے قیصر روم ہرقل کے دربار میں پہونچے ہیں اور اُس نے غیر مسلم عربوں کو بلوا کے جنکے سرگروہ ابوسفیان تھے

آنحضرتؐ کے اور مسلمانوں کے حالات پوچھے ہیں تو منجملہ اور سوالوں کے اُسکا ایک سوال یہ بھی تھا کہ "جب لوگ اس شخص (رسول اللہ صلعم) پر ایمان آتے ہیں تو کبھی کوئی اُس دین سے پھرتا بھی ہے یا نہیں؟" اسکا جواب ابوسفیان باوجودیکہ دین اسلام کی مخالفت کرنا چاہتے تھے یہی دے سکتے تھے کہ کوئی نہیں"۔ لیکن آجکل ہم اسکے خلاف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صدہا مسلمان دین مسیحی کو اختیار کر لیتے ہیں اسکے اسباب پر غور کرنا علمائے دین اور مقتدایان اُمت محمدیہ کا کام ہے۔ ہمیں اس موقع پر یہ دکھانا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں بھی کئی مسلمان عیسائی ہو گئے تھے لیکن اُنکی حالت میں اور ان لوگوں کی حالت میں جو آجکل اسلام سے منحرف ہو جاتے ہیں بڑا فرق ہے۔

اسلام میں کسی مسلمان کے عیسائی ہونے کا سب سے پہلا واقعہ تو بادشاہ بنی غسان جبلہ بن ایہم غسانی کا ہے۔ بنی غسان کا ملک عرب کے شمال میں ارض یہود اور شام سے ملا ہوا تھا اور بعثت محمدی سے بہت پہلے بنی غسان اور اُنکے تاجدار دولت روم سے مغلوب ہو کے عیسائی ہو چکے تھے۔ نیز اسلام کے طلوع ہونے کے بعد تمام بنی غسان اور اُنکے فرماں رواد حاکم نے دین اسلام قبول کیا۔ مگر حضرت عمرؓ کے زمانے میں اتفاقاً اُن کا بادشاہ جبلہ ابن ایہم آستان بوسی خلافت کے لئے مدینہ میں آیا جسکا استقبال اہل مدینہ نے بڑے جوش و خروش سے کیا کیونکہ غسانی فرمارواؤں کی عظمت کے صدہا قصہ جاہلیت ہی میں اہل عرب میں مشہور تھے۔ اور شاہانہ شوکت و جبروت کا جو خاکہ اُنکی نظروں کے سامنے تھا وہ شاہان عالی غسان ہی کا تھا۔ لہذا حضرت عمرؓ نے بھی اُسکے استقبال میں کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ مگر بدنصیبی سے کسی غریب صحابی کا ہاتھ نادانستگی سے کچھ اس طرح جبلہ پر پڑ گیا کہ اسکی ازار (تہمت) کھل کے گر پڑی۔ جبلہ کے دل سے شاہی نخوت کی بو تو ابھی گئی نہ تھی بے اختیار ان صحابی کے تھپڑ مار بیٹھا۔ حضرت عمرؓ نے اسپر برہم ہو کے قصاص کا حکم دیا کہ وہ صحابی بھی جبلہ کے تھپڑ

مار لیں۔ اس سبکی و توہین کو جبلہ برداشت نہ کر سکا اور تعمیل قصاص کے لئے رات بھر کی اجازت مانگی۔ مگر صبح ہونے سے پہلے ہی بھاگ کے اپنے وطن ارض بلقا میں پہونچا اور جب دیکھا کہ یہاں بھی دُرہ عمری سے پناہ نہیں مل سکتی تو اپنے ہم قوموں کے بڑے گروہ کے ساتھ بھاگ کے قلمرو روم میں گیا۔ اور آخر قسطنطنیہ میں جا کے مع تمام ہمراہیوں کے پھر عیسائی ہو گیا۔ اور اُسی مذہب پر وہاں مرا۔ مگر زندگی بھر یہ حالت رہی کہ اپنے کئے پر پچھتاتا تھا۔ اور وطن کی صحبتوں اور عربوں کی انجمنوں کو یاد کر کے رویا کرتا تھا۔

لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ ایک اور مرتد کا ہے۔ جو خاص حجازی النسل عرب تھا۔ اور بنی مخزوم میں سے جس قبیلہ کی ایک یادگار حضرت خالد بن ولید بھی تھے۔

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از شام زخاک مکہ ابوجہل این چہ بوالعجبی ست

عمر بن عبد العزیز کے عہد خلافت میں اسی زمانہ کے ایک معزز شخص اسمٰعیل بن عبد الحکیم کا بیان ہے۔ کہ میں ایک دن خلیفہ مذکور کے دنیادارانہ دربار میں حاضر تھا کہ خلافت کا ایک سفیر جو مسلمان اسیروں کو رومیوں کے ہاتھ سے چھڑانے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ فرائض سفارت پورے کر کے واپس آیا۔ اثنائے کلام میں اُس نے ایک یہ واقعہ بیان کیا کہ :-

ایک دن میں قسطنطنیہ کی سیر کے لئے گھر سے نکلا اور گلی کوچوں میں اپنے خچر پر سوار پھر رہا تھا۔ کہ ناگہاں میرے کان میں آواز آئی کہ جیسے کوئی فصیح و بلیغ عربی لہجہ میں ایک نہایت ہی سوز و گداز کے ساتھ عجب درد بھری دلکش دھن میں شعر گا رہا ہے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے وطن گھر بار اور صحبت احباب کو بڑی حسرت کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ اُس کے اُن شعروں اُس کے نغمہ کی دلکش دھن۔ اور اُس کے دل کو پاش پاش کر دینے والے الفاظ نے میرے دل پر جادو کا اثر کیا۔ بے اختیار اُس کی طرف لپکا اور آخر جاتے جاتے معلوم ہوا کہ ایک بلند کھڑکی سے آواز آرہی ہے۔ خوش قسمتی سے اُس کھڑکی تک پہونچنے کے لئے زینہ بھی بنے ہوئے تھے۔ میں فوراً خچر سے اتر پڑا۔

اُس کی لگام کسی چیز سے اٹکا دی۔ اور زینہ پر چڑھ کے جھانکا تو نظر آیا کہ ایک شخص چت لیٹا ہوا ہے۔ ایک پاؤں دوسرے پر رکھے ہوئے ہے۔ اور لیٹے ہی لیٹے تین عربی شعروں کو گاتا ہے۔ جب گا چکتا ہے۔ تو پھوٹ پھوٹ کے رونے لگتا ہے۔ اور تھوڑی دیر رو لینے کے بعد پھر انہیں شروع کر دیتا ہے۔ اب مجھ میں صبر کی تاب نہ تھی بے اختیار کہا۔ السلام علیکم،، میری آواز سنتے ہی وہ سنبھل کے اٹھ بیٹھا۔ اور کہا وعلیکم السلام میں نے کہا لے اب آنسو پونچھ ڈالو۔ اور خوش ہو۔ کیونکہ تمہاری اسیری کا زمانہ ختم ہوا۔ میں امیر المومنین عمر بن عبد العزیز کا فرستادہ ہوں۔ اور اس لئے آیا ہوں کہ جتنے مسلمان قیدی اور سرکش بادشاہ کے پنجہ میں پھنسے ہوئے ہیں انھیں زر فدیہ (تاوان) ادا کر کے آزاد کراؤں" اس کا وہ ہنوز جواب نہیں دینے پایا تھا کہ میں نے کہا "اچھا یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

بولا مجھے کیا پوچھتے ہو؟ میں والبی کے نام سے مشہور ہوں اتفاقاً ان نصرانیوں کے ہاتھ میں اسیر ہو گیا۔ انھوں نے پکڑ کے مجھ پر اتنے ظلم کئے کہ مجبوراً ان کا دین قبول کر لیا" میں نے کہا تم مایوس نہ ہو۔ واللہ میں سب سے پہلے تمہارے آزاد کرانے کی تدبیر کروں گا۔ اور یہی امیر المومنین بھی کریں گے۔ بہ شرطیکہ تم دل سے کافر نہ ہو گئے ہو۔

بولا۔ میں تو خدا کی قسم کافر ہو گیا"

میں نے کہا "اچھا تو تمہیں قسم دلاتا ہوں کہ پھر مسلمان ہو جاؤ"

بولا "میں پھر مسلمان ہو جاؤں! اور ان دونوں بچوں کا کیا حشر ہو گا۔ جو یہاں موجود ہیں؟ کیا کہوں میں نے ایک نصرانیہ عورت سے نکاح کر لیا ہے۔ اور اس کے بطن سے دو بچے پیدا ہو چکے ہیں۔ علاوہ اس بات کا بھی خیال آتا ہے۔ کہ اب جو مسلمان ہو کے مدینہ میں چلوں گا تو چاروں طرف سے انگلیاں اٹھیں گی کہ وہ نصرانی آتا ہے۔ اور یہی سلوک ان بچوں اور ان کی ماں کے ساتھ ہو گا یعنی مجھ سے تو یہ ادا نہ ہو سکے گا۔

میں نے کہا۔ تم نے قرآن بھی پڑھا ہوگا۔ اب بھی اس کی کوئی سورت یاد ہے؟''
بولا ''ہاں پڑھا ہے۔ اور جب تک مسلمان تھا برابر تلاوت کیا کرتا تھا۔ مگر اب تو سب بھول گیا پس ایک یہ آیت یاد رہ گئی ہے۔ ربما یود الذین کفروا لو کانوا مسلمین۔ (اکثر یہ ہوتا ہے کہ کافروں کو تمنا ہوتی ہے۔ کاش ہم مسلمان ہوتے)

یہ جواب سن کے میں نے پھر اُسے اسلام کا شوق دلایا۔ اور اطمینان دلایا کہ تمہیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔

بولا ''مگر صلیب کی پرستش کرنے۔ شراب پینے اور سور کھانے کے دہتے جو لگ چکے ہیں کیسے چھوٹیں گے؟''

میں نے کہا بھلا یہ تمہارے کہنے کی بات ہے.؟ کیا تمہیں اسکا خیال نہیں۔ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان (مگر وہ جو مجبور کیا جائے۔ اور اس کا دل ایمان کی برکت سے مطمئن ہو) مگر میرے اس کہنے کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ میں سمجھاتا تھا۔ اور وہ بار بار یہی کہے جاتا تھا۔ کہ'' اس پرستش صلیب میخواری اور سور کھانے کے دہتے کیونکر مٹیں گے؟'' آخر میں عاجز ہو کے واپس چلا آیا۔

یہ حالت سنتے ہی عمر بن عبد العزیز نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کے کہا '' بار الٰہا! اتنی مہربانی کر کہ مجھے مرنے سے پہلے اس شخص پر قابو مل جائے۔ اسمٰعیل بن عبد الحکیم کا بیان ہے۔ کہ عمر بن عبد العزیز نے ایسی رقت قلب سے دعا مانگی تھی۔ کہ مجھے کبھی بھولتے کو نہ آتی۔ اور ہمیشہ یہ خیال رہا۔ کہ کبھی نہ کبھی یہ مرتد شخص اُس کے پنجے میں ضرور آجائے گا۔

غالباً اس واقعہ سے پہلے ایک بصری شخص بھی اس والبھی سے ملا تھا وہ کہتا ہے۔ میں کسی ضرورت سے قلمرو روم میں سفر کر رہا تھا۔ اتفاقاً رومیوں کے ایک قلعہ کے نیچے گذر ہوا۔ ناگہان میرے کان میں آواز آئی کہ جیسے کوئی شخص عربی کے چند شعر گا رہا ہے۔

(اور اُس نے بھی شعر بتاتے ہیں۔ جو عمر بن عبد العزیز کے سفیر مذکور نے بتائے تھے)
وہ دلکش نغمہ اور اس کفرستان میں سُن کے میں چونکتا ہوا اور پکار کے کہا ،، یہ کون گارہا
ہے ؟،، فوراً ایک خوش رُو اور تندرست آدمی فصیل کے اوپر نمودار ہوا۔ اور بولا
میں،، میں نے کہا ،، آخر تم کون ہو؟ اور اپنی سرگذشت تو بیان کرو؟،،
بولا ،، میں غازیان عرب میں سے ایک شخص ہوں۔ جہاں تم کھڑے ہو کبھی یہیں آ کے
میں بھی ٹھہرا تھا۔ ناگہاں اوپر ایک ایسی ملائک فریب اور پری تمثال نازنیں نمودار
ہوئی کہ دیکھتے ہی۔

صبر رخصت ہوا ایک آہ کے ساتھ ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ

آخر دل کو سنبھال کے میں نے اظہار شوق کیا۔ اور وہ کمال بیباکی اور شوخی سے بولی
منظور۔ بشرطیکہ میرا دین قبول کرو،، میں اُس کے حسن جمال کا شیدا ہو چکا تھا کہ شیطان
نے دل پر غلبہ کیا اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

گر کعبہ ہوا تو کیا بت خانہ ہوا تو کیا ہم عشق کے بندے ہیں مذہب سے نہیں واقف

بلا تامل اُس کے مذہب میں داخل ہو گیا۔ اور اپنے وعدے کے موافق میری بی بی بنگئی
بس اُس وقت میری یہ حالت ہے۔ جو تم دیکھ رہے ہو،،
میں نے پوچھا ،، قرآن کچھ اب بھی یاد ہے؟،،
بولا ،، بس اتنا ہی ربما یود الذین کفروا لو کانو مسلمین،، یہی آیت جسکا ترجمہ
ابھی بتایا جا چکا ہے۔
میں نے کہا ،، اگر تمہاری مرضی ہو تو ہم تمہاری طرف سے زرتاوان ادا کر کے تمہیں
عیسائیوں کے ہاتھ سے چھڑالیں۔
یہ سُن کے وہ کچھ دیر تک سر جھکا کے سونچتا رہا۔ پھر بولا ،، خواہ مخواہ کیوں جھگڑے
میں پڑے ہو۔ جاؤ اپنی راہ لو۔ بس خدا حافظ ہے یہ کہہ کے وہ غائب ہو گیا۔

اصلی واقعہ یہ ہے۔ کہ یہ دالبھی پہلی صدی ہجری کا ایک مشہور مغنی تھا۔ جو خاص مدینہ کا رہنے والا تھا۔ اور اُس نے گانے بجانے میں ایک حد تک مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ مے کشی کی بھی لت تھی۔ کچھ دنوں تو نبھتی چلی گئی جبکہ والیان بنی امیہ اس قسم کے گناہوں سے زیادہ تعرض کرتے تھے۔ لیکن جب عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے والی حجاز مقرر ہوا تو اُس نے دالبھی کو میکشی کے جرم میں گرفتار کر کے دُرّے لگوا دیئے۔ اس سزایابی پر اُس نے مدینہ سے بھاگ کے ارض روم کی راہ لی۔ اور عیسائیوں کی قلمرو میں جا کے مقیم ہوا ممکن ہے۔ کہ یہ دمشق سے مجاہدین صائفہ[عہ] (موسم گرما کی لڑائی) کے ساتھ مل کے روانہ ہوا ہو۔ مگر روانگی کا محرک شوق جہاد نہیں بلکہ صرف اسلامی تہذیب و تادیب سے بچنا تھا۔ اور یہ بھی بعید نہیں۔ وہاں پہونچ کے اظہار ارتداد کا ذریعہ اس عورت پر فریفتہ ہونا ہوا ہو۔ ورنہ اصل میں یہ پہلے ہی دین اسلام سے علیحدہ ہونے پر آمادہ ہو چکا تھا۔ اس کا بھائی مدینہ میں مدتوں تک زندہ رہا۔ جو غالباً اُس کی بے دینی پر افسوس کرتا ہوگا۔

اس مرتد کی اور نیز جبلہ بن ایہم ملک غسان کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں اپنے عیسائی ہو جانے پر مرتے دم تک نادم و پشیمان رہے۔ اور پچھتایا کرتے تھے۔ خصوصاً دالبھی تو یہ بھی مانتا تھا۔ کہ میں کافر ہوں خدا کو بھولا ہوا ہوں۔ اور شیطان کے پھندے میں اسیر ہوں۔ مگر افسوس مے کشی اور جوش عشق نے بے بس

عہ ملک روم میں اتنی شدت سے سردی پڑتی ہے۔ کہ جاڑوں میں لشکر کشی دشوار تھی۔ لہذا معمول ہو گیا تھا کہ ہر سال گرمیوں کا موسم شروع ہوتے ہی جہاد شروع کیا جاتا۔ اور صائفہ کے نام سے یاد کیا جاتا بنی عباس کے زمانہ میں صائفہ کا ایک فیشن سا ہو گیا تھا جس میں حصول ثواب کے لئے اکثر علماء دینداراور ائمہ علوم بھی شریک ہو جایا کرتے۔ اگرچہ انکا ماحصل اب سوا سرحدی چھین جھپٹ کی کچھ نہیں باقی رہا تھا۔

کر دیا ہے۔ ایسے شخص کی نسبت حضرات شیعہ تو بلا تامل کہدیں گے کہ وہ مومن تھا۔ اور تقیۃً کافر بنا ہوا تھا۔ جس سے اس کی ایمانداری پر حرف نہیں آسکتا۔ مگر اہل سنت کے اصول کے مطابق بھی چونکہ سپاہ نے کفر کو اس نے کفر تسلیم کر لیا۔ لہذا سوا فاسق و فاجر کے کوئی شکل سے اُسے کافر کہہ سکے گا۔ بہرحال گو مرتد تھا۔ مگر دل سے مسلمان تھا۔ اور کوئی چیز اس کی ایمانداری اور توحید کو ایسا نہ بدل سکی کہ صلیب پرستی دے کشی وغیرہ کو بے دینی نہ تصور کرتا۔

بخلاف اس کے ضعف ایمانی اس سے بڑھ کے کون دلیل ہوگی کہ آجکل جو مسلمان عیسائیوں کے پھندے میں کپنس کے عیسائی بنتے ہیں۔ انہیں بعض حقیقتہً اسلام سے تنفر بلکہ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ حضرات مقتدایان دین۔ اس تفرقہ کو مٹائیے اور مسلمانوں کو پھر ایسا بنا دیجئے کہ ان میں سے کوئی کافر بھی ہو جائے تو اپنے آپ کو کافر ہی سمجھے

جبلہ بن ایہم

اس کی اصیلت یہ ہے کہ جاہلیت عرب میں جس طرح حیرہ میں آل منذر کی سلطنت قائم تھی جو کہ ایران کی سرحد پر ہونے کے باعث خسروان عجم کے ماتحت اور ان کے زیر اثر تھی۔ اسی طرح عرب کے شمال میں بنی غسان کی ایک اور زبردست سلطنت تھی جو شام وارض یہود کی سرحد پر ہونے کے باعث قیاصرہ روم کے ماتحت اور انکی ہم مذاق وہم مذہب تھی۔ شہر تبوک کے قریب پرانا عالیشان شہر بلقا ء اس کا مرکز حکومت تھا۔ اور خاندان شہریاری جفنہ ،، نام کسی پرانے مورث کی نسبت سے "آل جفنہ" کہلاتا تھا۔ صحرانشینان عرب عموماً یہاں آکے فرمان رواؤں اور امیروں سے تمدن و تہذیب کا سبق لیتے تھے۔ اور شعرائے عرب دور دور سے آکے انکی مدح میں غزل سرائی کرتے تھے۔ اس ملک کا آخری تاجدار جبلہ بن ایہم تھا جس کے دادا حارث اعرج

کی شجاعت اور اُس کی دادی ماریہ ذات القرطین (دو گوشواروں والی) کی خوشی وتنعم
اور تراش خراش سارے عرب میں مشہور تھی۔ جبلہ نے جب دیکھا کہ سارے قبائل عرب
نے علم اسلام کے آگے سر جھکا دیا۔ اور کل شرفائے عرب مسلمان ہو گئے اور نظر آیا
کہ حجاز کی دینی حکومت کی سطوت ایران و روم کی صدیوں کی عظمت و جبروت کو
پامال کئے ڈالتی ہے۔ تو خود بھی دین اسلام کے قبول کرنے پہ آمادہ ہو گیا۔

مسند خلافت پر اُن دنوں حضرت فاروق اعظم جلوہ افروز تھے۔ اور درۂ عمری
کے رعب سے ساتوں ارض کانپ رہے تھے۔ اس نے حضرت عمر کو اپنے ارادے کی
خبر دی۔ اور لکھا کہ میں چاہتا ہوں بذات خود مدینہ میں حاضر ہو کے پیغمبر آخر الزمان
پر ایمان لاؤں۔" اہل مدینہ کے لئے یہ ایک بہت بڑا مژدہ تھا۔ کیونکہ انہیں فرمانروائے
بنی غسان اور تاجدار بلقا کے ایمان لانے کی جتنی خوشی ہو سکتی تھی نہ قیصر روم کے
دین اسلام قبول کرنے پہ ہو سکتی تھی۔ اور نہ خسرو عجم کے مسلمان ہونے پہ جناب فاروق
نے جواب میں خوش ہو کے تحریر فرمایا۔ شوق سے آؤ۔ ایمان لانے کے بعد تم کو
وہ تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے جو ہمیں حاصل ہیں۔ اور تمہارے فرائض بھی وہی ہو جائینگے
جو ہمارے فرائض ہیں۔ یہ قابل اطمینان جواب پا کے جبلہ پانچ سو سواروں
کے جلوس کے ساتھ مدینہ طیبہ میں آیا۔ مدینہ کے قریب پہنچ کے اس نے اپنے
جلوس کے تمام سواروں کو دھاری دار زربفت کی قبائیں پہنائیں اور معلوم ہوتا
تھا کہ اس کا سارا لشکر سونے کے دریا میں غرق ہے۔ بیچ میں اپنا مرصع زریں
تاج سر پہ رکھے اور مرصع و مغرق کپڑے پہنے خود تھا۔ اور اُس کے سونے کے تاج
میں اور جواہرات کے ساتھ اُسکی دادی ذات القرطین کے دونوں مشہور گوشوارے
بھی آویزاں تھے۔

اُس کے آنے کی خبر مشہور ہوئی تو تمام اہل مدینہ تماشا دیکھنے یا استقبال کیلئے

شہر کے باہر گئے اور بچے اور گھروں کی بیٹھنے والی عورتین تک اُس کے جلوس کی آن بان دیکھنے کے شوق میں گھروں سے باہر نکل پڑین۔ اور اس سے پہلے مدینہ میں کبھی ایسی دہوم دہام نہیں نظر آئی تھی۔ غرض بڑے جلوس اور ٹھاٹھ کے ساتھ جبلہ مدینہ میں داخل ہوا۔ حضرت عمرؓ سے ملا۔ آپکے ہاتھ پہ ایمان لایا۔ اسی قدر نہیں چند روز بعد موسم حج آیا۔ تو اُس نے حضرت فاروق کے ہمراہ حج کرنے کے شوق میں مکہ معظمہ کا سفر کیا اور تمام مسلمانون کے ساتھ حج کیا۔

اسی حج کے زمانہ میں ایک دن خانہ کعبہ کے گرد طواف کر رہا تھا۔ عرب کے دنیاپرست اُمرا کی پرانی وضع یہ تھی کہ ازار (تہمت) ایسی باندھتے جو بہت نیچی ہوتی اور اُس کے دونوں سرے زمین پر لوٹتے جاتے۔ جسکی حدیث میں سخت ممانعت آگئی ہے جبلہ بھی اسی وضع میں تھا۔ اور شاید اُس کے ابھی ابھی مسلمان ہونے کے خیال سے لوگون نے اُس کی یہ متکبرانہ وضع گوارا کر لی تھی۔ اتفاقاً اسی وقت بنی فزارہ میں کا ایک معمولی شخص بھی مصروف طواف تھا۔ نادانستگی سے اُس کا پاؤں جبلہ کی ازار کے اُس کونے پہ پڑ گیا جو زمین پر لوٹ رہا تھا۔ ساتھ ہی جبلہ نے بے دیکھے قدم آگے بڑھایا تو ازار کھل گئی۔ جبلہ کا سا مغرور فرمان روا بھلا اس کی تاب لا سکتا تھا؟ اُس فزاری شخص کے منہ پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ ناک کا بانسہ پھوٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ فزاری نے آکے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ اور آپکے دربار عدالت سے دادخواہ ہوا آپنے آدمی بھیج کے جبلہ سے دریافت کیا کہ آپ نے اس بے گناہ شخص کو تھپڑ کیوں مارا؟ اس نے کہلا بھیجا "اُس شخص نے بڑی گستاخی کی کہ میری ازار پہ اس طرح پاؤں رکھدیا کہ وہ کھل گئی۔ اور یہ تو طمانچہ ہی تھا۔ مجھے اگر حرمت کعبہ کا پاس نہ ہوتا تو میں اُس کا سر اڑا دیتا"۔ حضرت عمر نے فرمایا "خیر جو ہونا وہ تو ہو تا مگر آپنے اپنا یہ جرم تو قبول کر لیا کہ اُسے تھپڑ مارا ہے۔ اب یا تو جس طرح بنے اُسے راضی کیجئے ورنہ بحکم شریعت

"والجروح قصاص" میں فزاری کو مجاز کرونگا کہ ویسا ہی تھپڑ آپ کے مارے "۔ یہ سُن کے جبلہ کو حیرت ہوگئی۔ بولا "مجھ سے اور قصاص! میں ایک فرمانروا ہوں اور ایک ادنیٰ درجہ کا بازاری شخص ہے"۔ جناب فاروق نے فرمایا "مگر اسلام نے تمہیں اور اُس کو برابر کردیا۔ اب سوا نیکوکاری کے کوئی مایۂ فضیلت نہیں ہوسکتا۔ انّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم"۔ جبلہ نے کہا "میں تو سمجھتا تھا کہ اسلام لانے سے میری عزت بڑھ جائے گی جو کچھ آبرو ہے وہ بھی ڈوب جائے!"۔ جناب عدالت پناہ نے فرمایا "بے شک عزت بڑھ گئی اور وہ یہی باہمی مساوات اور اخوت دینی ہے"۔ اس پر بگڑ کے جبلہ بولا "یہی حال ہے تو میں پھر عیسائی ہو جاؤنگا"۔ حضرت فاروق نے فرمایا "اور تم مرتد ہوگئے ہو تو میں تمہارا سر اڑادونگا"۔ جناب فاروق کی زبان سے یہ کلمہ سن کے جبلہ کے ہوش ٹھکانے ہوئے اور دل میں سوچنے لگا کیا کروں۔

اب یہاں یہ حالت ہو رہی تھی کہ ایک طرف بنی فزارہ کا ایک بڑا گروہ جمع ہوگیا تھا۔ کہ ہمارے قبیلہ والے کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے پائے۔ دوسری طرف جبلہ کے سوار دست بہ شمشیر تھے کہ ہمارے تاجدار کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہ ہو جائے آخر جبلہ نے حضرت عمر سے کہا "تو پھر مجھے سوچنے کے لئے کل تک کی مہلت دیجئے۔ جو کچھ مناسب ہوگا کل کرونگا۔ حضرت نے فرمایا "منظور ہے"۔ اس کے بعد جب رات کو اندھیرا چھا گیا۔ جبلہ اپنے تمام ہمراہیوں کے ساتھ مکہ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور ایسا دہشت زدہ اور خائف تھا۔ کہ گویا اپنے ملک اور وطن میں سے ہو کے گزرا مگر وہاں بھی دم نہ لیا۔ آگے بڑھ کے قلمرو روم میں داخل ہوا اور وہاں بھی اطمینان نہ ہوا تو بھاگتے بھاگتے خاص قسطنطنیہ میں داخل ہوا۔ اور ہرقل سے ملا ہرقل شہسواران اسلام کی متواتر فتحوں کی خبر سن کے سہا ہوا تھا جب دیکھا کہ

عربوں ہی میں کا ایک سردار بلکہ تاجدار اُن سے ٹوٹ کے میرے پاس چلا آیا ہے
تو بہت خوش ہوا۔ بڑی قدر و منزلت سے پیش آیا۔ حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کی۔ اور
بہت بڑی جاگیر دی کہ اطمینان و فارغ البالی اور شاہانہ تمکنت سے زندگی بسر
کر سکے۔ بہت سے غسانی لوگ اُس کے ساتھ ہی چلے گئے تھے بہت سے لڑ بھڑ کے پہونچے
جو لشکر روم میں اعلیٰ درجہ کے سپہ گردن کا کام دیتے۔

چند روز بعد حضرت فاروق اعظم نے ہرقل کے پاس اپنا ایک ایلچی بھیجا۔ اُسے
دین اسلام کی تبلیغ کی۔ اور اپنے خط میں بتایا کہ اسلام میں کیسی کیسی خوبیاں ہیں ہرقل
نے دین اسلام کے قبول کرنے سے تو انکار کیا۔ مگر چند اور شرائط پہ صلح کر لی۔
کیونکہ بغیر صلح کئے اُسے اپنی سلطنت نہایت ہی خطرناک حالت میں نظر آتی تھی
ہرقل جب حضرت عمر کے خط کا جواب لکھنے کو بیٹھا تو اُسے خود بخود ملک غسان جبلہ
کا خیال آیا اور جناب فاروق کے ایلچی سے پوچھا۔ تم اپنے اُس ملکی و قومی بھائی سے
سے بھی ملے جو ہمارے دین کا گرویدہ ہو کے یہاں آیا اور ہمارا مہمان ہوا۔ اُس نے
کہا "نہیں"۔ بولا ود تو اُس سے جا کے مل آؤ۔ جب تک میں خط کا جواب لکھتا ہوں "

خود اُس ایلچی کا بیان ہے کہ قیصر کے قصر سے نکل کے جب میں جبلہ بن ایہم کی
ڈیوڑھی پر پہونچا تو وہاں بھی مجھے ویسے ہی ٹھاٹھ اور ویسی ہی شان و شوکت نظر
آئی جیسی کہ خود ہرقل کے دروازے پر تھی۔ دربانوں اور حاجبوں کا ہجوم تھا۔ غلام
زرق برق کپڑے پہنے اور فوجی لوگ ہتھیار لگائے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ اور ملنا درکنار
جبلہ کو آنے کی اطلاع کرانا بھی دشوار معلوم ہوتا تھا۔ بڑی دشواریوں سے میں نے اپنی اطلاع
کرائی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے باریابی کا موقع ملا۔ اندر جا کے اُس کی صورت
دیکھی تو پہچان نہ سکا۔ اس لئے کہ جب مدینہ میں آیا ہے اُس کی ڈاڑھی مونچھیں سیاہ
تھیں اور اب سفید ہو گئی تھیں۔ اتنے میں اُس نے ایک خادم کے ہاتھ سے سونے کا

براده لے کے ڈاڑہی پر چھڑک لیا۔ اور اُس کے چہرے کے تمام بال سُنہرے ہو گئے
اور ڈاڑہی سونے کے سہرے کی طرح جگمگا اٹھی۔

وہ ایک شیشہ کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے پائے آبنوس کے تھے اور اُن میں
سونے کی پچی کاری تھی۔ سر پر ایک مرصع تاج پہنے تھا۔ جس کی چوٹی پر صلیب تھی۔
مجھے پہچانتے ہی اُس نے کھینچ کے اپنے برابر تخت پر بٹھا لیا۔ اور مسلمانوں کے حالات
پوچھے۔ میں نے کہا۔ الحمدللہ کہ سب خیریت سے ہیں اور انکی تعداد روز بروز
بڑہتی ہی جاتی ہے۔ جب آپ نے دیکھا اُس سے اب بار چہار زیادہ بڑھ گئے
ہیں۔ پوچھا "عمر بن الخطاب کیسے ہیں؟" میں نے کہا "وہ بھی بہت اچھے اور مع الخیر
ہیں یہ سنتے ہی میں نے دیکھا کہ اسکا چہرہ مکدر ہو گیا۔ مجھے اُس کی یہ حرکت ایسی بُری
معلوم ہوئی کہ تخت سے اُتر کے زمیں پر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے متعجب ہو کے کہا
میں تو تمہاری قدر و منزلت کرتا ہوں اور تم اس سے بھاگتے ہو؟ میں نے کہا
ایسے تخت پر بیٹھنے سے ہمیں رسول اللہ صلعم نے منع فرمایا ہے" بولا "ہاں
انھوں نے منع کیا ہے۔ خدا ان پر رحمت نازل کرے۔ مگر میں تو کہتا ہوں کہ
اپنا دل پاک و صاف رکھو اور جیسے فرش اور تختوں پر چاہو بیٹھو" اُس کو جناب
رسول خدا پر درود بھیجتے سُن کے میرے دل میں حوصلہ پیدا ہوا اور میں نے کہا جبلہ
افسوس تم ایمان نہیں لاتے! آخر اس میں تامل کیا ہے؟ بولا" ان سب باتوں اور
اپنے مرتد ہونے کے بعد بھی کیا میں مسلمان ہو سکتا ہوں؟ میں نے کہا۔ بیشک
بنی فزارہ ہی میں کا ایک شخص مرتد ہو گیا تھا۔ تم سے زیادہ اُس نے مسلمانوں
سے دشمنی کی۔ اُن کے منہوں پر تلواریں ماریں۔ لیکن اب خدا کی ہدایت کرنے
سے دین اسلام قبول کر لیا۔ اور اُس کا اسلام قبول بھی کر لیا گیا۔ میں ابھی
ابھی اُسے مدینہ میں چھوڑ کے آیا ہوں" بولا" اب مجھے رہنے ہی دو" پھر

کچھ سوچ کے کہا "اچھا یہ شرط کرو کہ عمر بن الخطاب مجھے اپنی بیٹی دے کے داماد بنائیں گے۔ اور مجھی کو اپنا ولی عہد قرار دیں گے۔" میں نے کہا "اُن کی بیٹی دلوانے کی تو میں ذمہ داری کرتا ہوں مگر اسکا اطمینان نہیں دلا سکتا کہ وہ تمہیں ولی عہد بھی تسلیم کر لیں گے۔"

اب جبلہ نے اس گفتگو کو ٹال کے اپنے ایک خادم کی طرف اشارہ کیا جو فوراً تعمیل حکم کو دوڑا۔ اور چند لمحون کے بعد خدام کے آگے دسترخوان بچھایا۔ اور طرح طرح کی نفیس غذائیں سونے کے بادیوں اور چاندی کی رکابیوں میں لاکے چنی گئیں۔ جب سب کھانا آگیا۔ تو اس نے مجھ سے کہا "کھاؤ" میں نے ہاتھ روکا اور کہا وہ جناب رسالت مآب صلعم نے سونے چاندی کے ظروف میں کھانے سے منع فرمایا ہے یہ سُن کے پھر پہلے کی طرح بولا "ہاں انھون نے منع فرمایا ہے۔ خدا ان پر رحمت نازل کرے مگر میں تو کہتا ہوں کہ دل پاک و صاف رکھو اور جیسے برتنوں میں جی چاہے کھاؤ۔" آخر میں نے مٹی کے برتنوں میں اور اُس نے اپنے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھایا۔ جب غذا سے فراغت ہوئی تو چاندی کی سلفچی میں سونے کے آفتابے سے ہاتھ دھلوائے گئے۔ اور دسترخوان بڑھا یا گیا۔

اب اس نے پھر اپنے خادم کو اشارہ کیا اور دم بھر میں دس مرصع طلائی کرسیاں داہنی طرف اور دس بائیں طرف لاکے بچھا دی گئیں۔ چند دقیقہ نہ گزرے ہونگے کہ دونوں جانب ان کرسیوں پر نہایت ہی حسین دمہ جبین گلرخسار دجادو نگاہ نازک اندام غرق در مرصع لباس سے آراستہ اور سر سے پاؤں تک زیور سے لدی اور دلہن بنی ہوئی آکے اُن کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ میں نے زندگی بھر میں کبھی ایسی پری جمال نازک اندام مہ وشیں نہیں دیکھی تھیں۔ میں انہیں بیس نازنینوں کی ہر ہر ادا فریفتہ ہو رہا تھا۔ کہ ناگہاں ایک اور گل رخسار آئی جسکا حسن و جمال سب سے بڑھا ہوا تھا بے اختیار

زبان سے نکلا "تبارک اللہ احسن الخالقین" اس گل اندام کے سر پہ ایک زرین تاج تھا۔ اور اس چوٹی پہ ایک زندہ طائر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں مشک وعنبر سے بھرا ہوا جام تھا اور بائیں ہاتھ میں گلاب کا ایک کٹورا۔ اور اس حسینہ کا فر ماجرا نے جبلہ کے سامنے ادب سے ٹھہر کے سیٹی بجائی فوراً وہ طائر اس کے تاج سے اڑ کے نیچے آیا۔ اور گلاب کے جام میں لوٹنے اور غوطہ لگانے لگا۔ اس کے بعد اس نے پھر سیٹی بجائی تو وہ اڑ کے جبلہ کے تاج کے گرد چکر لگانے اور اس کے تاج کی صلیب پہ گلاب چھڑکنے لگا۔ میں تو یہ تماشا دیکھ کے متحیر تھا مگر جبلہ مارے خوشی کے ہنس پڑا۔ اور دانت جڑوں تک کھل گئے۔

اب یہ نازنین تو ایک طرف کھڑی ہو گئی اور جبلہ نے داہنی جانب والی نازک اندام سے کہا۔ اب تم ذرا مجھے خوش کر دو۔ فوراً انھوں نے اپنے چنگوں کے تار کھینچ کے اور شرملا کے چند اشعار گائے جن میں پہلا شعر یہ تھا۔

للہ درّ عصابۃ نادمتہم ؎ یوماً بجلق فی الزمانِ الاوّلِ*

ان اشعار میں اس کے خاندان کی خوبیاں اور اس کی عظمت بتائی گئی تھی اور ان کی فیاضی و دریا دلی کی مدح تھی۔ ان اشعار کا نغمہ سن کے وہ پھر اس قدر ہنسا کہ مسوڑے کھل گئے۔ اور میری طرف دیکھ کے کہا۔ جانتے ہو یہ اشعار کس کے طبعزاد ہیں؟"، میں نے کہا "نہیں" بولا یہ حسان بن ثابت کے شعر ہیں جو محمد (صلعم) کے مداح خاص ہیں۔"

اس کے بعد اس نے بائیں طرف والی مہ جبینوں کی طرف متوجہ ہو کے کہا "اب تم مجھے ذرا رلا دو" حکم کے ساتھ ہی ان گل اندام نے اپنا ساز درست کیا اور چند اشعار گائے جن کا مطلع یہ تھا۔

* ترجمہ: کیا خوب تھے وہ لوگ جن سے اگلے زمانہ میں ایک دن (مقام) جلق میں ہم صحبت رہا تھا۔

لِمَنِ الدَّارُ اَقفرتْ بمعانٍ   بَیْنَ اَعلَی الیَرمُوکِ فالجمانِ عه

یہ اشعار نہ تھے۔ بلکہ دراصل فرمانروایان بنی غسّان کے قصر شاہی کے اُجڑنے کا مرثیہ تھا۔ جس میں اُس کے محل کے گرد کی سینری دکھائی گئی تھی۔ اُسکو سن کے جبلہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر آنکھوں سے آنسو پونچھ کے مجھ سے پوچھا اور جانتے ہو یہ شعر کس نے کہے ہیں؟" میں نے کہا نہیں" بولا" یہ بھی حسان بن ثابت ہی کے شعر ہیں" اس کے بعد اُس نے چند شعر خود پڑھے جس میں دوسرا شعر یہ تھا۔

فیالیتَ اُمِّی لم تلدْنی ولیتنی   رَجعتُ الی الاَمرِ الذی قال لی عمر

ان شعروں میں اُس نے اپنے تھپڑ مارنے اور اپنی ضد پہ قائم رہنے پہ پچھتا کے اپنی جلاوطنی پہ اظہار اندوہ و ملال کیا تھا۔

یہ شعر پڑھ چکنے کے بعد ذرا ٹھہر کے مجھ سے پوچھا "حسان بن ثابت زندہ ہیں؟" میں نے کہا جس وقت میں مدینہ سے چلا ہوں اُس وقت تو بقید حیات تھے۔ اُن کی زندگی کی خبر سُن کے اُس نے ایک خلعت اور چند نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے اونٹ منگوا کے میرے حوالہ کئے اور کہا "مدینہ میں پہونچ کے اگر حسان کو زندہ پانا تو یہ دونوں چیزیں میری طرف سے ہدیۃً اُن کو دے دینا۔ اور اگر انتقال کر چکے ہوں تو خلعت اُن کے گھر میں دے دینا اور ان اونٹوں کو اُن کی قبر پہ لیجا کے ذبح کر دینا" میں نے کہا "بہتر"

اب میں اُس سے رخصت ہو کے ہرقل کے پاس گیا۔ اور اُس کا خط لے کے مدینہ طیبہ میں واپس آیا۔ اور کُل واقعات امیر المومنین عمر فاروق کی خدمت میں

عــه (ترجمہ) مقام معان میں (یعنی) تبوک کے اُس طرف اور وادی جمان میں یہ کسکا مکان ہے جو اجڑ گیا

عــه (ترجمہ) کاش میری ماں مجھے نہ جنتی اور کاش میں وہی بات مان لیتا جو (امیر المومنین) عمر (رضی اللہ عنہ) نے مجھ سے کہی تھی۔

عرض کردیے۔ جب میں نے جبلہ کو دین اسلام کیطرف مدعو کرنے اور اس کی شرطوں کا ذکر کیا تو حضرت عمر نے فرمایا "تم نے دونوں باتوں کا وعدہ کیوں نہ کر لیا؟ جب اسلام اُس پر اثر کر چکتا تو پھر اُس کے فیصلوں پر وہ خود ہی چلنے لگتا" اس کے بعد جب میں نے اُس کے ہدیوں کا ذکر کیا جو اُس نے حسان بن ثابت کے لئے بھیجے تھے تو آپ نے فوراً آدمی بھیج کے حسان بن ثابت کو بلوایا۔ حسان بن ثابت اب آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ ایک شخص انہیں پکڑ کے لایا۔ انھوں نے آتے ہی کہا" یا امیرالمومنین۔ مجھے آپ کے پاس سے آل جفنہ (خاندان جبلہ بن ایہم حکمران بنی غسان) کی بو آتی ہے" آپ نے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا "ہاں یہ اُس سے ملے آتے ہیں" اس کے جواب کے ساتھ ہی حسان نے مجھ سے کہا تو بھائی جو کچھ لائے ہو دو۔ وہ فیاض ہے اور فیاضوں کی نسل سے ہے۔ جاہلیت میں میں نے اُس کی مداح سرائی کی تھی جس پر خوش ہو کے اُس نے قسم کھائی تھی کہ جب کوئی تمہارا شناسا ملیگا اُس کے ہاتھ تمہیں کوئی نہ کوئی ہدیہ ضرور بھیجوں گا۔

ابو عثمان سعید بن مسجح

یزید بن معاویہ پہلا شخص ہے۔ جسکے عہد سے اسلام میں عشرت پرستی کا آغاز ہوا اور اُسی کے آخر عہد میں یا یوں کہئے کہ اُسی کے کارناموں کی یادگار ہیں ایک عجیب طریقہ سے عرب لوگوں میں ایک باقاعدہ فن موسیقی شروع ہوا۔ وہ ہنوز زندہ تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر لوگوں نے مکہ میں یزید کی بے اعتدالیوں سے تنگ آ کے بیعت کی۔ اور انھوں نے خلافت کا دعویٰ کیا۔ اسکی خبر دمشق میں پہونچی تو ابن زبیر کے مقابلہ کے لئے لشکر روانہ ہوا۔ اور حصین بن نمیر نے آکے مکہ معظمہ کا محاصرہ کر لیا یہ محاصرہ ایک زمانہ تک قائم رہا تھا اور اثنائے محاصرہ میں سوم شوال سنہ ۶۴ھ کو ہولناک

رات کو جب کہ ابر گھرا ہوا تھا۔ بادل گرج رہا تھا اور بجلی چمک رہی تھی۔ اور ہوا کے جھونکے زور و شور سے چل رہے تھے محاصرہ کرنے والوں کا شور و غوغا سن کے ابن زبیر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اہل شام شہر کے اندر تو نہیں گھس پڑے۔ مگر اندھیرے میں کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ حریف کی حالت کا پتہ لگانے کے لئے انھوں نے حکم دیا کہ ایک نیزے میں مشعل باندھ کے بلند کی جائے گو ہوا بہت تیز تھی۔ جیسے ہی وہ مشعل بلند کی گئی اُس سے کچھ چنگاریاں اُڑ کے غلاف کعبہ تک پہونچیں۔ فوراً غلاف نے آگ پکڑ لی اور بیت اللہ شریف پر ہولناک شعلے بھڑکنے لگے۔ لوگ آگ بجھانے کو دوڑے مگر کسی کا کچھ زور نہ چلا۔ اور رات بھر میں جل کے خانۂ کعبہ ایک ویران کھنڈر رہ گیا۔ ایک قریشیہ عورت بھی اُسی آگ میں جل کے مر گئی۔ اور لوگ چونکہ سہمے ہوئے تھے کہ کعبہ کی اس بے حرمتی سے کہیں عذاب الٰہی نہ نازل ہو جائے۔ لہٰذا سب لوگ نہایت رقت قلب اور کمال خضوع و خشوع سے اُس عورت کے جنازہ کے ساتھ گئے۔ اُدھر ابن زبیر کی رات بھر یہ حالت رہی کہ سربسجدہ پڑے ہوئے تھے۔ اور درگاہ رب العزت میں رو رو کے دعا کر رہے تھے کہ خداوندا! میں نے یہ جان کے نہیں کیا! میرے اس گناہ کی پاداش میں اپنے بندوں کو نہ ہلاک کرنا! میری یہ پیشانی تیرے آگے حاضر ہے میرے ساتھ تو جو سلوک چاہے کر!!!

اب دن کو جب لوگوں کو ذرا ڈھارس بندھی تو بے فکر ہو کے اپنے گھروں کی طرف چلے۔ اس وقت ابن زبیر نے روکا اور کہا ”واہ واہ! تمہارے گھر کی ایک اینٹ بھی گر جاتے تو اُسے اُس کی جگہ پھر لا کے لگا لیتے ہو اور مرمت و اصلاح کئے بغیر دم نہیں لیتے۔ اور یہ خدا کا گھر ویران ہو گیا ہے اسے یونہیں پڑا رہنے دو گے؟“ اُن کے کہنے سے لوگوں کو تعمیر کعبہ کی فکر ہوئی۔ ابن زبیر نے چاہا کہ منہدم دیواروں کے باقی ماندہ حصّہ کو بھی کھود کے برابر کر دیں پھر اپنے آثار پر دیواریں

اٹھائیں۔ مگر ڈر کے مارے کوئی ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ چنانچہ خود ابن زبیر نے پھاؤڑا ہاتھ میں
لے کے کھودنا شروع کر دیا تب اور لوگ بھی شریک ہوئے۔ اب انھوں نے دیوار دکھو
منہدم کر کے برابر کیا۔ اور کعبہ کو زیادہ وسیع کر کے تعمیر کیا یعنی وہ گرد کی جگہ جو حجر
کہلاتی ہے۔ اور ایک کٹہرے میں محصور ہے خاص بیت اللہ کے اندر شامل کر لی۔ اور
لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو کہا "خود جناب رسالتمآب نے حضرت عائشہ رضہ سے
فرمایا تھا کہ تمہاری قوم والے اگر نئے نئے مسلمان نہ ہوتے تو میں کعبہ کو ویسا ہی بنا دیتا
جیسا کہ ابراہیم کے زمانہ میں تھا۔ اور حجر کو اس کے اندر شامل کر دیتا" اس حدیث
کی تصدیق کے لئے زمین کھودی تو حضرت ابراہیم کے ڈالے ہوئے آثار برآمد ہو گئے
اور انہیں پر ابن زبیر نے نئی عمارت قائم کی۔ اس کے علاوہ زبیر نے آمنے سامنے
کعبہ میں دو دروازے رکھے تھے تاکہ لوگ ایک سے داخل ہوں اور دوسرے
سے نکل جائیں عہ۔ ابن زبیر نے عمارت کعبہ کے لئے بڑا اہتمام کیا تھا۔ چنانچہ فارسی
اور رومی معمار بلوا کے اس مقدس کام پر مامور کئے جن میں سے فارسی معمار اپنا
تعمیر کا کام کرتے وقت اکثر گایا کرتے تھے۔

اتفاقاً ان دنوں بنی جمح کا ایک غلام سعید ادھر سے گزرا۔ جسے گانے کا شوق تھا
قدرتی طور پر خوش گلو واقع ہوا تھا۔ اور طبعی شوق سے اکثر گنگنایا کرتا۔ اس نے جو

عہ خانہ کعبہ میں آگ ۳ شوال یا ۳ ربیع الاول ۶۴ھ کو لگی تھی۔ ۶۵ھ میں عبداللہ بن زبیر نے
نیا خانہ کعبہ بنا کے کھڑا کر دیا۔ اور ۷۳ھ میں ابن زبیر کی شہادت کے بعد عبدالملک نے کعبہ
کو منہدم کرا کے پھر انہیں پرانے آثار قریش پر تعمیر کرا دیا۔ اور کہا ابن زبیر نے یہ عائشہ پر جھوٹ
لگایا ہے۔ کہ انہوں نے جناب رسالتمآب صلعم سے سنا تھا کہ کعبہ کے گرد کی زمین تعمیر ابراہیمی میں
عمارت کعبہ کے اندر شامل تھی لیکن جب لوگوں نے کہا کہ ابن زبیر کے سوا دیگر [illegible] نے بھی
آنحضرت سے یہی روایت کی ہے تو کہنے لگا اچھا ہوتا کہ میں کعبہ کو ویسا ہی ہونے دیتا مگر اب تو ہو چکا

فارسیوں کا یہ نغمہ سُنا تو بھلا لگا۔ بار بار جا کے اُن لوگوں کا گانا سننے اور اُس کے ساتھ اُن کی دھنوں میں عربی اشعار کے گانے کی مشق کرنے لگا جس میں کامیابی ہوئی اور چند روز بعد یہ حالت ہوئی کہ جو اُسے گاتے سنتا محو ہو جاتا۔ سعید۔ ذہین۔ طباع اور ذکی تھا۔ مالک کو اُس سے محبت تھی۔ اور اکثر کہا کرتا اس لڑکے کی کوئی خاص شان ضرور ہونے والی ہے۔ میں اسے کب کا آزاد کر چکا ہوتا۔ مگر اس کی خوبیاں ایسی ہیں جو مجھے چھوڑنے نہیں دیتیں۔ اگر یہ زندہ رہا تو اس کی عظمت اور اپنی پیشین گوئی کو دیکھوں گا۔ اور مر جاؤں تو سب کے سامنے کہتا ہوں کہ یہ آزاد ہے"

اسی اثنا میں ایک دن مالک نے اُسے گاتے سنا تو چونک پڑا۔ اور بلا کے کہا "ذرا اُسی طرح پھر تو گانا" اب کی جو وہ گایا تو پہلے سے زیادہ سنبھال کے اور زیادہ دلکش سروں میں گایا۔ مالک نے سن کے کہا "وہ جو میں کہا کرتا تھا اُس کا ایک نمونہ یہ بھی ہے" پھر پوچھا "تم نے یہ دھن کہاں سے سیکھی؟" "میں نے فارسی معماروں کو خانہ کعبہ تعمیر کرتے وقت گاتے سنا تھا۔ ان کی دھن مجھے اچھی معلوم ہوئی اس لئے میں نے اُسے عربی اشعار میں قائم کر لیا" اس جواب پر غالباً مالک کے دل میں خیال گزرا کہ اب اس نے ایک لطیف فن کی طرف توجہ کی ہے تو اسے تکمیل کا موقع دینا چاہیئے چنانچہ اُسی وقت اُسے آزاد کر دیا۔ مگر سعید آزاد ہونے کے بعد بھی اپنے آقا ہی کی خدمت میں رہا۔ اور اب اُس کی شائستگی اور تمیز داری پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ وہ اگرچہ سیاہ فام حبشی تھا مگر خوش رو اور خوش منظر تھا۔ مکہ میں پیدا ہوا تھا۔ مسجح نام ایک شخص کا بیٹا تھا ابو عثمان یا ابو عیسیٰ کنیت تھی۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ بنی جمح نہیں بلکہ وہ نوفل بن حرث بن عبد المطلب کے گھرانے کا غلام تھا۔

بہرحال آزاد ہونے کے بعد اُسے فن موسیقی کی تکمیل کا شوق ہوا تو مکہ معظمہ سے نکل کے ملک شام میں گیا۔ اور ایک زمانہ تک رومی گویوں سے مل جل کے اور اُن کی

صحبت میں بیٹھ کے رومی راگوں میں مہارت پیدا کی۔ پھر شام کو خیرباد کہہ کے ارض فارس میں گیا۔ اور وہاں کے گویوں سے ملا۔ بربط و سرود کا بجانا سیکھا اور پوری طرح کمال حاصل کر کے ارض حجاز میں واپس آیا۔ اب یہاں اُس نے اطمینان سے بیٹھ کے اس جانب توجہ کی کہ رومی اور فارسی دُھنوں کو عربی میں منتقل کرے۔ جو دھنیں عربی زبان میں آسکیں اُن کو تو اختیار کر کے رواج دیا۔ اور جو دھنیں نہ آسکیں اُنکو متروک و مسترد کر دیا۔ الغرض وہی پہلا شخص ہے جس نے عربی موسیقی کو ایک مستقل فن بنایا جسکے بڑے بڑے باکمال بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں پیدا ہوئے۔ اور جو چند ہی روز بعد ابن مسجح کی کوشش سے ایسا وسیع اور مزدوری فن تھا۔ کہ فارابی اور ابن سینا کے سے ایسے فلاسفہ اسلام بھی بغیر اس فن کے جانے اپنے آپ کو ناقص اور غیر مکمل تصور کرتے تھے۔

اب جو سعید بن مسجح ایک صاحب کمال موسیقی دان بن کے مکہ میں واپس آیا تو لوگوں میں اُس کی بڑی قدر ہوئی۔ کوئی صحبت بغیر اُس کے پُر لطف نہ سمجھی جاتی تھی۔ اور کسی جشن طرب میں جب تک ابن مسجح کا نغمہ نہ سنا جاتا لوگوں کو مزہ نہ آتا۔ تمام لوگوں کے گلے میں اُسکی بنائی ہوئی دھنیں اتر گئیں جن کے ذریعہ سے عربوں کی فتوحات کی طرح ابن مسجح کی تانیں بھی اطراف عالم سے جا جا کے ٹکرانے لگیں۔ جب کسی کو فن غنا سے ذرا بھی مس تھا۔ ابن مسجح کی پیروی کرنے لگا۔ اور بعد کے تمام مغنی اُس کے نقش قدم پہ قدم رکھتے رہے۔

ابن مسجح کے آقا کا ایک اور کمسن غلام تھا عبید بن سریج جس کی آواز میں بہت ہی لوچ تھا۔ اور جس نے عجیب حیرت انگیز گلا پایا تھا۔ اس غلام کو اُس نے ابن مسجح کے سپرد کیا اور کہا "تم اسے فن موسیقی کی تعلیم دو"۔ ابن مسجح نے ابن سریج کو تعلیم دینا شروع کیا اور چند ہی روز میں ایسا باکمال موسیقی دان اور فخر زمانہ مغنی بنا دیا کہ عہد

خلفا میں اُس کی بے انتہا قدر تھی۔ جہاں جاتا آنکھوں پر بٹھایا جاتا اور وہی زمانہ اولین اسلام کا یادگار زمانہ مشہور و معروف مغنی ہے۔

عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں ابن مسجح کے موسیقی کو یہاں تک فروغ حاصل ہوا کہ اُس کے نام کی ان تمام ملکوں میں جہاں اہل عرب پہونچے تھے نہایت ہی شہرت ہوگئی اور مکہ میں جتنے نوجوان شرفائے قریش تھے اُس کا گانا سننے کے شوق میں دیوانے ہو رہے تھے۔ ہوتے ہوتے عبدالملک سے جا کے کسی نے شکایت کر دی کہ مکہ میں سعید بن مسجح نام ایک سیاہ فام شخص پیدا ہوا ہے۔ جو جوانان قریش کو غارت کئے ڈالتا ہے۔ اور سب اپنی دولت اُس کے پیچھے لٹائے دیتے ہیں" یہ سن کے عبدالملک نے اپنے والی مکہ وحمان اشقر کو لکھا کہ" سعید بن مسجح کے پاس جو کچھ مال و اسباب ہو ضبط کر لو اور اُسے حکم دو کہ میرے پاس حاضر ہو" اس کی فوراً تعمیل ہوئی۔ اور ابن مسجح تباہی میں پڑ کے دمشق کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ایک شخص مل گیا جسکے ہمراہ چند گانے والی خوش گلو لونڈیاں تھیں۔ اُس نے انہیں علم موسیقی کا استاد سمجھ کے اپنے ساتھ لے لیا۔ اور آپ گاتے بجاتے اور اپنے مذاق کی صحبت کا مزہ لوٹتے ہوئے دمشق پہونچے۔

وہاں پہونچ کے ابن مسجح نے لوگوں سے دریافت کیا کہ امیرالمومنین کی خدمت میں کون زیادہ آتا جاتا ہے۔ اور کسے اُن کے مزاج میں درخور حاصل ہے لوگوں نے کہا کہ جوانان قریش جو اُن کے بنی اعمام ہیں اُن کی خدمت میں زیادہ بے تکلف ہیں یہ دریافت کر کے ابن مسجح قریشی نوجوانوں کے ایک جتھے میں گیا۔ اور پوچھا آپ میں کوئی ایسا بھی ہے جو ایک حجازی غریب الوطن کو اپنے یہاں جگہ دے؟" یہ سوال سنتے ہی وہ سب نوجوان ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ کیونکہ اتفاقاً اسی شب کو وہ دمشق کی ایک مشہور مغنیہ کے ہاں جانے والے تھے جسکا نام دبرق الافق تھا۔ اور

سب نے تو اُسے ٹال دینا چاہا۔ مگر ایک دریا دل قریشی نوجوان بولا "میں آپ کو اپنا مہمان بناؤں گا" پھر اپنے رفقا سے کہا "آپ لوگ برق الافق کے یہاں جائیں۔ اور میں انہیں لے کے اپنے گھر جاتا ہوں" یاران صحبت نے کہا "یہ نہیں ٹھیک ہے۔ ابھی برق الافق کے وہاں تم بھی چلو اور اپنے اس مہمان کو بھی لے چلو۔" الغرض ابن مسجح داخل دمشق ہوتے ہی نئے نوعمر رفیقوں کے ساتھ ایک مغنیہ کے گھر پہونچا۔

وہاں جب دسترخوان بچھا تو سعید نے کہا "میں ایک سیاہ فام حبشی ہوں۔ شاید آپ میں سے کسی صاحب کو میرے ساتھ کھانا کھانے میں کسرشان نظر آتی ہو۔ اس لئے میرے واسطے کھانا الگ بھیج دیجئے۔ کسی کونے میں بیٹھ کے کھالونگا۔" یہ کہہ کے ابن مسجح بلا انتظار جواب خود ہی اٹھ کے ان ہم پیالہ وہم نوالہ لوگوں کی صحبت سے الگ ہوگیا۔ ان لوگوں کو اس پہ ندامت تو ہوئی مگر اسکی جرات نہیں ہوئی کہ بُلا کے دسترخوان پہ ساتھ بٹھالیں۔ اُس کے لئے الگ کھانا بھجوا دیا۔ اب دور شراب کی باری آئی۔ اور اس میں بھی ابن مسجح ان لوگوں سے الگ ہی رہا۔

کھانے پینے کے بعد گانے کی نوبت آئی۔ ایک چوکی جو پہلے سے بچھی ہوئی تھی اس پر دو خوبصورت لونڈیاں آ کے بیٹھیں اور عشا کے وقت تک گاتی رہیں اتنی دیر گانے کے بعد وہ اٹھ کے گئیں۔ اور ایک پری تمثال نازنین کو لے کے آئیں جو آتے ہی ناز و انداز سے چوکی پر رونق افروز ہوئی۔ اور وہ دو لونڈیاں داہنے بائیں چوکی کے نیچے زمین پر بیٹھ گئیں۔ اُس کے حسن و جمال کو دیکھ کے ابن مسجح کے دل میں بھی ایک گدگدی پیدا ہوتی اور اسکی تعریف میں یہ شعر پڑھا۔

فَقُلْتُ اَشَمْسٌ اَمْ مَصَابِیْحُ بِیْعَۃٍ ۔ بَدَتْ لَکَ خَلْفَ السِّجْفِ اَمْ اَنْتَ حَالِمٌ

اُن کی زبان سے یہ شعر سُن کے وہ حسینہ جو خود برق الافق تھی نہایت برافروختہ ہوئی اور بولی" اب میں ایسی گئی گذری ہوئی ہوں کہ ایک کالا کلوٹا حبشی میری تعریف میں شعر پڑھتا ہے؟ اُسے برہم دیکھ کے ہم صحبتوں نے ابن مسجح کو بہت گھور گھور کے دیکھا۔ اور برق الافق کو سمجھا بجھا کے راضی کیا۔ الغرض بہزار دقت وہ سیدھی ہوئی اور ایک چیز گائی۔ ابن مسجح سے پھر نہ رہا گیا۔ بے اختیار بول اٹھا" واہ! کیا خوب گائی ہو!" اب کیا تھا اُس حسینہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور اُس کا مالک بگڑ کے بولا" میری ایسی حسین و نازنین پری جمال کی تعریف اور ایک حبشی کا منہ!"

اب اُس جوان قریشی نے جو ابن مسجح کو ساتھ لایا تھا نادم ہو کے اپنے گستاخ مہمان سے کہا" تو پھر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ تشریف لے جا کے میرے گھر پر ٹھہریں میں بھی تھوڑی دیر میں آجاؤنگا۔ کیونکہ آپ کا یہاں ہونا سب لوگوں کو گران ہے" ابن مسجح یہ سنتے ہی جانے کے لئے اٹھا۔ مگر اور لوگوں نے کہا" یہ نامناسب ہے کہ ایک شخص کو ہم یوں کج خلقی کے ساتھ اپنی صحبت سے نکال دیں۔ آپ شوق سے ہماری صحبت میں بیٹھئے مگر اس کا ذرا لحاظ رہے کہ ادب اور تمیزداری سے بیٹھئے۔ جب لوگ آپ کی تعریف نہیں چاہتے ہیں تو آپ کو مخواہ مخواہ تعریف کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟" ابن مسجح نے کہا" بہتر اب میں تعریف نہ کروں گا" اور بیٹھ گیا۔

اب برق الافق نے ایک اور چیز گائی۔ اور اس کے ختم ہوتے ہی ابن مسجح نے کہا" حرام زادی۔ تو غلط گا رہی ہے۔ یوں نہیں اس چیز کو یوں گا" اور یہ کہہ کے اُس چیز کو خود جو گایا تو لوگوں پر عالم محویت طاری ہو گیا۔ برق الافق

عہ میں نے کہا یہ آفتاب ہے یا کیمیا کے چہرہ ہے جو پردہ کے پیچھے سے تجھے نظر آگئی یا تو خواب دیکھ رہا ہے

گھبرا کے چونکی ... اُتر پڑی۔ اور بولی خدا کی قسم یہ ابوعثمان سعید بن مسجح ہیں!" اور چاروں طرف سے متجسس نگاہیں ان پر پڑنے لگیں۔ اور ان کی زبان سے نکلا "ہاں ہوں تو وہی"۔ اب کیا تھا؟ ہر شخص آنکھیں بچھانے کو تیار تھا۔ مگر یہ اٹھ کھڑے ہوتے اور کہا "اب میں تمہارے پاس نہ ٹھہرونگا"۔ سبھوں نے خوشامد درآمد کر کے منانا شروع کیا۔ ہر ایک کو تمنا تھی کہ یہ اس کے مہمان ہوں۔ مگر انھوں نے اپنے میزبان کی طرف اشارہ کر کے کہا "مہمان تو تمہارے اس سردار کا ہو چکا۔ مگر اب صحبت میں نہ ٹھیروں گا"۔

سبھوں نے پوچھا "آخر یہ تو فرمایئے کہ آپ کا یہاں کیونکر آنا ہوا؟" انھوں نے اپنی ساری سرگذشت بیان کی جسے سن کے ان کا نوجوان میزبان بولا "مجھے شب کو امیر المومنین کی صحبت میں جانا ہے اور اگر انہیں خوش مزاج پاؤنگا تو آج ہی تمہیں ملا دوں گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہیں حدی کی اچھی چیزیں یاد ہیں؟" حدی اہل عرب کا بہ راگ ہے جس کا ہمارے یہاں ادنیٰ درجہ کے اہیروں میں رواج ہے۔ انھوں نے کہا "اگرچہ کبھی حدی خوانی نہیں کی ہے۔ مگر امید ہے کہ گاؤں گا"۔ یہ سن کے وہ بولا "تو لو سنو۔ میرا مکان امیر المومنین کے بمقابل ہے۔ تم وہاں ٹھہرنا جس وقت میں امیر المومنین کے شگفتہ اور بشاش ہونے کی خبر کر دوں تم میرے مکان کی کھڑکی سے گردن نکال کے حدی کو کوئی چیز گانے لگنا۔

اس قرار داد کے بعد وہ شخص انہیں اپنے گھر پر چھوڑ کے ایوان میں گیا۔ اور عبد الملک کو جس گھڑی خوب شگفتہ اور خوش دیکھا ابن مسجح کو خبر کر دی۔ اس نے اسی کھڑکی سے گردن نکال کے حدی کی ایک چیز گائی۔ اس نغمہ کی آواز عبد الملک کے کان میں پہونچی تو کہا "یہ کون ہے؟" اس نے عرض کیا کہ ایک حجازی شخص میرے یہاں آکے مہمان ہوا ہے وہی گا رہا ہے"۔ عبد الملک بولا "اسے میرے سامنے

بلواؤ" فوراً چوبدار دوڑے اور ابن مسجح حاضر ہو کے آداب بجالایا خلیفہ نے کہا "ہُذَی کی کوئی اچھی چیز گاؤ" ابن مسجح گایا۔ پھر تھوڑی دیر میں عبدالملک نے کہا "تمہیں وہ گیت بھی یاد ہیں جو قافلہ کے چلتے وقت گائے جاتے ہیں؟" عرض کیا "جی ہاں" اسے سن کے بولا اب اور مزہ دار چیز گاؤ اس طرح ابن مسجح نے دو چار چیزیں گائیں تو عبدالملک مست ہو کے جھومنے لگا۔ اور بولا "مجھے یقین ہو گیا کہ تو کوئی بڑا مشہور و معروف شخص ہے۔ کیونکہ یہ نغمے جو میں نے تجھ سے سنے بالکل غیر معمولی ہیں بتا کہ تو کون ہے؟" اب ابن مسجح نے موقع دیکھ کے راز کھولا اور عرض کیا امیرالمومنین میں وہ مظلوم و ستم رسیدہ ہوں جسکا گھر بار سرکار میں ضبط ہوا اور زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے لئے وطن سے نکال دیا گیا ہوں میرا نام سعید بن مسجح ہے اور مکہ کا ایک غریب الوطن مغنی ہوں" یہ سن کے عبدالملک مسکرایا اور بولا "بس ثابت ہو گیا کہ نوجوان قریش اپنی دولت جو تمہارے پیچھے لٹا دیتے تھے تو اس میں معذور و مجبور ہیں" اسکے بعد انعام و اکرام سے سرفراز کر کے اسکا قصور معاف کیا اور عامل حجاز کو لکھا کہ ابن مسجح کا مال و اسباب واپس کر دیا جائے۔ اور اس کے بعد پھر کوئی اس سے تعارض نہ کرے۔

ہمیں سعید بن مسجح کی تاریخ وفات نہیں معلوم ہو سکی۔ لیکن اُس کے حالات دیکھنے سے اُس کا زمانہ صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ عبداللہ بن زبیر کے عہد خلافت سے اُس کا نشو و نما شروع ہوا۔ اور عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں اُسکی ہر جگہ شہرت تھی۔

تمام شد